

فردوس بریں

PDFBOOKSFREE.PK

عبدالحکیم شریف

فردوس بربیں

از

عبدالحکیم شریف

پریوں کا غول

اب تو ۱۵۶۵ھ ہے، مگر اس سے ڈیڑھ سو سال پیشتر سیاہوں اور خاصیت حا جیوں کے لیے وہ کچی اور اونچی سڑک نہایت ہی اندیشہ ناک اور پُر خطر تھی جو بحر خزر یعنی ملک ماژندران اور علاقہ شروع ہوئی ہے اور شہر بابل میں ہو کے شاہنامے کے قدیم دیوستان یعنی ملک ماژندران اور علاقہ رو دبار سے گدرتی اور کوہ سار طالقان کو شمالاً جنوبًا قطع کرتی ہوئی شہر قزوین کو نکل گئی ہے۔ متوں سے اس سڑک کا یہ حال ہے کہ دن دہاڑے بڑے بڑے قافلے کٹ جاتے ہیں اور بے گناہوں کی لاشوں کو بر ف اور سردی مظلومی قتل و غارت گری کی یا دگار بنائے سا الہا سال تک باقی رکھتی ہے۔

ان دنوں ابتدائی سرماکازمانہ ہے۔ سال گز شستہ کی بر ف پوری مکھلنے نہیں پائی تھی کہ بر ف بر سنا شروع ہو گئی۔ مگر ابھی جاڑا اتنے درجے کو نہیں پہنچا کہ موسم بہار کے نمونے اور فصل کی دلچسپیاں بالکل مت گئی ہوں۔ آخری موسم کے دو چار پھول باقی ہیں اور کہیں کہیں ان کے عاشق و قد روان بلبل بد خشائی بھی اپنی ہزار داستانی و نغمہ سنجی کے راگ سُناتے نظر آ جاتے ہیں۔ یہ کوہستان عرب کے خشک و بے گیاہ پہاڑوں کی طرح برہنہ اور دھوپ میں جھلسے ہوئے نہیں بلکہ ہر طرف سایہ دار درخت اور گھنی جھاڑیوں نے نیچر پرستوں اور قدرت کے حقیقی قدر انوں کے لیے عَمَدَه عَمَدَه عشرت کدے اور تہائی کی خلوت گاہیں بنارکھی ہیں۔ اور جس جگہ درختوں کے جھنڈ تھے، وہاں آسمان کے نیلے شامیانے کے نیچے قدرت نے گھاس کا سبزہ اور مخملی فرش بچھادیا ہے جس پر بیٹھ کے کوئی شراب شیراز کے لطف اٹھانا چاہے تو یہاں نہر کرنے کے بد لے نہر ویرنجان موجود ہے جو شاید ابھی ڈیڑھ صدی بھی نہیں گزری کہ روہ سفید سے کاث کے پہاڑوں کے اندر ہی اندر مختلف

گھاٹیوں میں گھمائی اور آخ رشہر خرم آباد کے قریب بحر خزر میں گرائی گئی ہے۔

ان ہی دلچسپیوں اور قدرت کے ان ہی نظر فریب منظروں نے اس کو ہمارے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنت ان ہی گھاٹیوں میں ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ قدیم دیوالوں کو کیومرث ورستم وزیریمان کے زور پر بازو نے فنا کر دیا، مگر ان کی یاد گار میں بہت سی پریاں آج تک ان تہائی کے مقامات میں سکونت پذیر ہیں۔ خوش عقیدہ لوگوں میں سے اکثر وہ نے ان پریوں کو اڑتے دیکھا ہے اور بعض سیاحوں کو تو پریوں کے بڑے بڑے ہوش ربانیوں گھاٹیوں سے ناگہاں نکل پڑتے نظر آئے۔ یہ بھی سننا جاتا ہے کہ جو کوئی یکہ و تہا ان پریوں کے غول میں آتا ہے، فوراً مر جاتا ہے۔

مگر پریوں اور قدیم دیوالوں سے زیادہ ظالم ملا جدید اور باطنیہ لوگ ہیں جو اس علاقے میں آباد اور پھیلے ہوئی ہیں۔ اور جو پُرانے اصول و عقائد کا مسلمان ان کے ہاتھ پڑ جاتا ہے، کسی طرح جاں بر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جمادی الاول، جمادی الآخر اور رجب کے مہینوں میں ان کے مظالم کی دھوم مجھ جاتی ہے جس کی وجہیہ ہے کہ علاقہ ہائی ترکستان وغیرہ اور استراخان کے مسلمان جب تج کو جاتے ہیں تو جہازوں پر بحر خزر سے پار ہو کے اسی علاقے میں اُترتے اور اسی کو ہمارا طالقان کو طے کرتے ہوئے ارض عراق کو جاتے اور پھر وہاں سے خاکِ پاکِ حجاز کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کے مظالم کی ہر جگہ شہرت ہو گئی ہے اور بہت سے لوگوں نے یہ راستہ چھوڑ دیا ہے مگر پھر بھی بعض بے پروا مسلمان اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں آنکھتے ہیں۔ علی الخصوص آمل اور اس کے مضادات کے لیے تو اور کوئی راستہ ہی نہیں۔

یہ سڑک جس کا اوپر ذکر آیا، بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر صرف وہی

ہے جہاں یہ سڑک نہر وینجان کے کنارے کنارے گز ری ہے۔ اس مقام سے علاقیہ روڈ بار کے میدان ختم ہو گئے اور کوہستان سخت اور پیچیدہ نشیب و فراز کی ابتداء ہے۔ یہاں سے کچھ آگے بڑھ کے سڑک اور طرف گئی ہے اور نہر کوہ البرز کے دانتوں میں چکر کھا کے دشوار گزار اور پیچیدہ گھاٹیوں میں غائب ہو گئی ہے۔ شام کوشائد ہی چند گھریاں باقی ہوں گی۔ آفتاب سامنے برف آلو ڈچوٹیوں کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس کی کمزور کرنوں نے جو تھوڑی گرمی پیدا کر دی تھی، مٹ گئی اور ہوا کے سرد جھونکے جو بلند برفتان سے پھیلتے ہوئے آتے ہیں، انسان کے لیے کمپا دینے کو کافی ہیں۔

اس جگہ پر اور ایسی حالت میں شمال کی طرف سے دو مسافر سر سے پاؤں تک کپڑوں میں لپٹے اور دو بڑی گلھڑیوں کی صورت بنائے ہوئے آہستہ آہستہ آرہے ہیں۔ دونوں اپنے چھوٹے چھوٹے اور تھکے ماندے گدھوں پر سوار ہیں۔ ان کی سست روئی اور مجموعی حالت سے خیال ہوتا ہے کہ کسی گاؤں کے قریب کے مੁلا یا فقیر ہیں جو امارت اور سپاہیانہ دونوں وضعوں سے جدا کسی دینی غرض اور تقدس کی شان سے اس سفر کو نکلے ہیں۔ مگر نہیں۔ وہ قریب آگئے اور معلوم ہوا کہ مੁلا ہیں نہ مشائخ بلکہ دونوں نو عمر شریف زادے ہیں، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ ان کے لباس اور وضع سے چاہے نہ ظاہر ہو مگر بُشرے بتاتے ہیں کہ کسی معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی نامی اور شریف گھرانے سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ موٹے موٹے اور لمبے چوڑے کملوں کے نیچے جنہیں سر سے پاؤں تک پیٹ لیا ہے، دونوں شرافتے آمل کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مرد جو ایک خوبصورت نوجوان ہے، ایک اونی کفتان پر بڑا پوستین کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ سر پر قدیم لمبی تر کی ٹوپی ہے جو بانس کی تیلیوں سے

ایک مخروطی صورت میں بنائے کے بکری کی سیاہ کھال سے مژہ دی گئی ہے۔ ٹوپی پر عمامہ ہے اور اسکے کئی پیچ سر سے نیچے اُتر کے کانوں اور گلے میں لپٹنے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں موزے اور ایک اونی پا جامہ ہے۔ کمر میں چڑھے کی پینٹی کسی ہے، جس میں خنجیر لگا ہے اور تلوار لٹک رہی ہے۔ اس نوجوان کے پاس کمان اور تیروں کا ترکش بھی ہے۔ مگر اس عہدِ قدیم کے یہ ضروری اسلحہ گدھے کی زین میں بند ہے ہیں اور یہی ایک حربہ ہے جس کے ذریعے سے شکار کر کے یہ دلا ورنو جوان اپنے اور اپنی دل رُبَار فیقہِ حیات کے لیے قوتِ لایموت حاصل کرتا ہے۔ الغرض ایک گدھے پر تو یہ نوجوان سوار ہے اور دوسرے پر ایک اٹھارہ انیس برس کی پرمی جمال۔ موٹے موٹے کپڑے اور بھڈے پوستین اس کے زاہد فریبِ حُسن کو بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ مگر ایک مہوش کی شوخ ادائیاں کہیں چھپائے چھپی ہیں! جس قدر چہرہ کھلا ہے، حسن کی شعائیں دے رہا ہے، اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی ناز نہیں وحسمیں پھر نظر نہیں آئے گی۔ ہماری آفیٹ روزگار مہ جبیں ایک زرد ریشمی پا جامہ پہنے ہے جو اور پر سے نیچے تک ڈھیلا اور پاؤں کے گھوٹ پر خوش نما پچھت کے ساتھ بندھا ہے۔ گلے میں دیباۓ سرخ کا ایک کرتا ہے اور سر پر نیلی پھولدار اطلس کی خمار۔ لیکن یہ سب کپڑے ایک پھولے پھولے پوستین کے اندر رچپے ہوئے ہیں۔ جو چیز کہ اس کے عورت ہونے کو عام طور پر ظاہر کر رہی ہے، وہ چھوٹی چھوٹی سیکڑوں چوٹیاں ہیں جو خمار کے نیچے نکل کر ایک شانے سے دوسرے شانے تک ساری پیٹھ پر بکھری چلی گئی ہیں اور راستے کے نشیب و فراز یا گدھے کی تیز روی سے بار بار گھل جاتی ہیں۔

اس دل رُبَار کی کے حسن و جمال کی تصویرِ دکھانا مشکل ہے۔ مگر غالباً یہ چند باتیں مشتاق دلوں میں اور آرزومند نگاہوں کے سامنے اس کے زاہد فریب چہرے کا ایک معمولی ساخا کہ قائم کر

سکیں۔ گول آفتابی چہرہ جیسا کہ عموماً پہاڑی قوموں میں ہوتا ہے، سُنے اور کھنچنے ہوئے، سرخی کی جھلک دینے والے گال، بڑی بڑی شرابی آنکھیں، لمبی نوک دار پلکیں، بلند مگر کسی قدر پچھلی ہوئی ناک اور خمدار ہونٹ، باریک اور ذرا پچھلی ہوئی با چھیں، چھوٹے سے سانچے میں ڈھلی ہوئی نوک دار چھوڑی، شرگیں اور معمولی جھلکی نظروں کے ساتھ شوخ اور بے چین چشم واپر واپر اس تمام سامان حُسن کے علاوہ تمام اعضا و جوارح کا غیر معمولی تناسب ہر شخص کو بے تاب و بے قرار کر دینے کے لیے کافی ہے۔

یہ دونوں نو عمر مسافر چاروں طرف کے منظروں کو دیکھتے ہیں اور مقامی دشواریوں کی وجہ سے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ دن کے آخر ہو جانے کے خیال سے ان کے نازک چہرے جنہوں نے ابھی تک تجربے کی پنجتگی نہیں حاصل کی، پریشان ہونے لگے ہیں۔ مگر اس پر بھی خوشی کا قفل نہیں گھلتا۔ ناگہاں کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کے نازغیں نے ٹھنڈی سانس لی اور باریک دفتریب آواز میں پوچھا ”آج کون سادن ہے؟“
نو جوان: (چکپے ہی چکپے حساب لگا کر) جمعرات۔

لڑکی: (حرست آمیز لبھے میں) تو ہمیں گھر چھوڑے آج پورے آٹھ دن ہوئے۔ (ذرا تامل کر کے) خدا جانے کون لوگ کیا کیا با تمیں کہتے ہوں گے اور کیسی کیسی رائیں قائم کی جاتی ہوں گی۔

نو جوان: یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑا دیا۔
لڑکی: (پھر ایک آہ سرد بھر کے) مجھے الزام بھی دیتے ہوں گے کہ نامحرم کے ساتھ چل آئی۔

نوجوان: زُمُرُد (اس لڑکی کا نام ہے) اب میں نامحرم نہیں ہوں۔ دو ہی چار روز میں ہم قزوین پہنچ جائیں گے اور وہاں پہنچتے ہی نکاح ہو جائے گا۔

زُمُرُد: (پھر ٹھنڈی سانس لے کر) خدا جانے وہاں تک پہنچنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں! راستے کی دشواریاں مشہور ہی ہیں۔ کوئی خوش نصیب مسافر ہو گا جو پریوں کے ہاتھ سے فج کے نکل جاتا ہو گا۔ اور ان سے فج بھی جائے تو ملاحدہ کیوں چھوڑنے لگے۔

زُمُرُد میں اس وقت ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس مقام نے اسے کوئی خاص بات یاددا دی ہے جس کی وجہ سے وہ چاروں طرف کے منظر کو ہر طرف سے مژمڑ کے دیکھ رہی ہے اور بار بار بار آہِ سر دھرتی ہے۔

نوجوان نے اس بات کا خیال بھی نہیں کیا اور معمولی لمحے میں کہنے لگا ”ملاحدہ کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے۔ اس لیے کہ ان کے نقیب آمل سبحانہ اللہ سے مجھے ایک خط مل گیا ہے۔ وہ ہمیں ایک مجرّب تعویذ کا کام دے گا۔ اور اس کے نذر کرتے ہی ہم قرمطی کے دستِ ستم سے نجات پائیں گے۔“

یہ باتیں کرتے وقت دونوں نو عمر مسافر اس مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک تو کہسار کی بلندی پر چڑھنا شروع ہوتی ہے اور نہر اس سے جدا ہو کے دشوار گزار گھاٹیوں اور گھنی خاردار جھاڑیوں میں گھنے کے لیے وہنی طرف مڑگئی ہے۔ نوجوان نے اپنے گدھے کو سڑک پر آگے بڑھایا، ہی تھا کہ زُمُرُد باغ روک کے کھڑی ہو گئی اور کہا ”نہیں حسین“ (یہ اس نوجوان کا نام ہے)۔

حسین: (حیرت سے زُمُرُد کی طرف دیکھ کر) پھر کہہ؟

زُمُرُد: جدھر نہ رہ بہرہ ہے۔

حسین: اُدھر تو راستہ نہیں۔

زُمرد: تم چلو تو سہی۔

حسین: آخر تم قزوین چلتی ہو یا کہ کہیں اور؟

زُمرد: نہیں۔ میری منزل مقصود قزوین نہیں۔ مجھے تو دیکھنا ہے کہ نہر کدھر گئی ہے۔

حسین: اُس طرف تو پریوں کا نشیمن ہے۔

زُمرد: ہونے دو۔

حسین: ستا ہوں کوئی اُدھر سے زندہ نہیں جاتا۔

زُمرد: یہی میں بھی چاہتی ہوں۔

حسین نے تعجب اور حیرت سے زمرد کی صورت دیکھی اور ایک متانت کی آواز سے کہا ”اور وہ حج کی نیت کیا ہوئی؟

زُمرد: ہے، مگر اپنے بھائی موی کی قبر پر جا کے فاتحہ پڑھوں تو مکہ معظمہ کا ارادہ کریں۔

حسین: تمہارے بھائی کی قبر! مگر یہ کیسے خبر کہ کہاں ہے؟

زُمرد: مجھے معلوم ہے۔ راستہ بھی جانتی ہوں اور اُس مقام کو بھی۔

حسین: (حیرت سے) تم؟ تم کیا جانو؟

زُمرد: خوب جانتی ہوں۔

حسین: کیا کبھی آئی تھیں؟

زُمرد: نہیں۔ مگر یعقوب جو بھائی موی کے مرنے کی خبر لایا تھا، اُس سے پُورا پتا دریافت کر چکی ہوں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ جہاں سے نہر سڑک سے علیحدہ ہوئی ہے، سڑک چھوڑ کے نہر

کے کنارے جانا چاہیے۔ اور بعد کی نشانیاں آگے چل کر بتاؤں گی۔

حسین: یعقوب کو کیا معلوم؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بلند اور پیچ دریچ پہاڑوں میں کون شخص کہاں اور کیوں کرمارا گیا؟

زُمرد: تم نہیں جانتے، بھائی موی اور یعقوب دونوں ساتھ تھے۔ اس مقام پر پہنچ کر نہر کے کنارے کنارے کچھ دور گئے تھے کہ کوہ البرز سے پریوں کا غول اُترا۔ ان کے ہاتھ سے بھائی تو مارے گئے اور یعقوب غش کھا کے گر پڑا۔ دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا تو بھائی کی لاش پڑی پائی۔ انہیں دفن کیا۔ پھر قبر بنائے اور قبر کے پاس ہی ایک چٹان پر ان کا نام کندہ کر کے واپس آیا۔

حسین: مجھے تو غب معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کہ پریوں نے یعقوب کو تو زندہ چھوڑ دیا اور تمہارے بھائی مارے گئے؟

زُمرد: اس کا یہ سبب ہوا کہ بھائی نے ایک پری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور یعقوب بُر дол تھا۔ پری زادوں کو دیکھتے ہی غش کھا کے گر پڑا۔

حسین: پھر ایسے مقام میں تو ہرگز نہ جانا چاہیے۔

زُمرد: نہیں حسین۔ میں ضرور جاؤں گی۔

حسین: فرض کرو کہ ہم وہاں پہنچتے اور ہمارے سامنے پریاں اُتریں تو؟

زُمرد: میں تو اس سے نہیں ڈرتی۔ اگر تمہیں خوف ہے تو نہ چلو۔

حسین: تم اکیلی جاؤ اور میں نہ چلوں؟ میں جو تمہاری محبت میں ہر وقت جان دینے کو تیار ہوں۔

زُمرد: حسین، سنو۔ میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ مانگی ہوں کہ تم شریف ہو اور اس زمانے سے جب کہ ہم دونوں مکتب میں ایک ساتھ پڑھتے تھے، مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ایک شریف لڑکی کو تم فقرہ دے کے نکال لائے ہو۔ میں خود شوق سے آئی ہوں۔ فقط اتنی امید پر کہ بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کے دو آنسو بہاؤں گی۔ جب یہ مقصد پورا ہو لے گا تو حج کو چلو گی۔

حسین: زمرد، اپنی جوانی اور اس کم سنی پر ترس کھاؤ اور اس ارادے سے بازاً آؤ۔

زُمرد: نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی آرزو کے لیے بے عزتی گوارا کی ہے۔

حسین: (ما یو یکی آواز سے) خداوند! اگر جان ہی جانی ہے تو میں مارا جاؤں۔

زُمرد: تیری مصیبت ان آنکھوں سے نہ دیکھی جائے گی (مسکرا کے) گھبراو نہیں۔ ہم دونوں کی کشش ایک دوسرے کو ٹھیکنگ لے گی۔ مارے گئے تو دونوں مارے جائیں گے۔ یہ کہہ کر زُمرد نے اپنے گدھے کو نہرو یونیجан کی طرف موڑا۔ دو ہی قدم چلی ہو گی کہ حسین نے روک کر کہا ”زُمرد، ذرا صبر کرو۔ چنان ہے تو کل چنان۔ اب شام ہوا چاہتی ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔“

زُمرد: بس اب چلے ہی چلو۔ کہیں آبادی ملنے کی تو امید نہیں اور جب جنگل ہی میں ٹھہرنا ہے تو یہاں وہاں دونوں جگہ برابر ہے۔ حسین سے کسی طرح انکار کرتے نہ بنی، چل کھڑا ہوا اور دل میں پس و پیش کرتا ہوا زُمرد کے ساتھ کوہ البرز کی تیرہ و تار گھائی میں گھسا۔ اب دونوں آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں، اور اس سنسان مقام کا رعب دونوں پر اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ بالکل خاموش ہیں۔

جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے۔ سردی ساعت بساعت بڑھ رہی ہے۔ سٹائل نے نہر کے بہنے کی آواز زیادہ تیز کر دی ہے جس سے اس مقام کے وحشت ناک منظر میں ایک ہیبت پیدا ہو گئی ہے۔ اب راستہ دشوار ہے۔ گدھوں سے اُترنا پڑا۔ دونوں آگے پیچھے اپنے

گدھے کے دہانے ہاتھ میں پکڑے چٹانوں سے نیچے اور جھاڑیوں میں گھتے چلے جاتے ہیں۔ آخوندیر کے سکوت کے بعد حسین نے مرعوب ہو کر کہا: ”بے شک پریاں ایسے ہی سنائے کے مقام میں رہتی ہیں۔ انسان کیا معنی، یہاں جانور کا بھی پتا نہیں۔

زُمرد: ہاں۔ اور سنتی ہوں کہ اس نہر میں اکثر جگہ پریاں نہاتی ہیں اور بالکھولے ہوئے آپس میں کھلائق اور چھپنخیں اڑاتی بھی نظر آ جایا کرتی ہیں۔

حسین: (چونک کر) یہ سننا تی آواز کیسی تھی؟ جیسے کوئی چیز سن سے کانوں کے پاس سے آگے نکل گئی۔

زُمرد: اور یہ مشہور بات ہے کہ پریوں کے تخت چاہے اڑتے نظر نہ آئیں، مگر ان کے نکل جانے کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔

حسین: یہ بھی ممکن ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی جانور تھا۔

زُمرد: جانور ہوتا تو دکھائی نہ دیتا؟

حسین: اگر چہابھی آفتاب غروب نہیں ہوا، مگر یہاں تم دیکھ رہی ہو کہ شام سے بھی زیادہ اندھیرا ہے۔ ایسے دھنڈ لکے میں بعض اوقات الویا بڑے بڑے چپگاڑ بھی اسی طرح سنائے کی آواز سے اڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

زُمرد: لیکن اصل میں یہ بھی وہی پری زاد ہیں جو مختلف جانوروں کی صورت میں رات کو نکلتے ہیں۔

حسین: ہوگا۔ (اتنا کہہ کے اس نے ارد گرد کے سین کو وحشت اور بزدلی کی نگاہوں سے دیکھا، اور نہایت پریشانی کی آواز میں کہا) شام ہوا چاہتی ہے اور تمہارے بھائی کی قبر کا کہیں پتا

نہیں۔

زُمُرِد: مگر میں تو بھائی کی قبر تک پہنچے بغیر دم نہ لوں گی۔

یہ کہتے ہی ایک نہایت تاریک گھائی نظر آئی جس میں نہر تو گئی ہے مگر دونوں جانب ایسی چکنی اور کڑی چٹانیں ہیں کہ انسان کا گزرنا بہت دشوار ہے۔ اس گھائی کی صورت دیکھتے ہی زُمُرِد ایک شوق اور بے خودی کی آواز میں چلا اٹھی ”ہاں، دیکھو! یہ دوسری علامت ہے۔ اسی میں سے ہو کے راستہ گیا ہے۔“

حسین: مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ادھر سے ہم جائیں گے کیونکر؟

زُمُرِد: جس طرح بنے، جاؤں گی ضرور۔

حسین: اور یہ گدھے؟

زُمُرِد: ان کو یہیں چھوڑ دو۔ واپس آ کے لے لیما۔

حسین نے اس مستقل مزاجی پر زُمُرِد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گدھے درختوں سے باندھے اور دونوں چٹانوں سے چمٹتے اور ہاتھوں سے پتھروں کے سروں کو پکڑتے ہوئے آگے روانہ ہوئے۔ کوئی دو گھری یہ محنت کا سفر کیا ہو گا کہ گھائی ختم ہو گئی جس سے نکلتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر ویرنجان اس گھائی سے گزر کے یکاً یک ایک نہایت ہی فرح بخش مرغ زار میں بہنے لگی ہے۔ عجوب لطف کا مقام تھا۔ قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی۔ شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کے تختے دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ نغمہ سخ طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے، جو ہر طرف شاہدان چمن کے حسن و جمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی، اور یہ جوش میں بھرے ہوئے عاشقان شاہدِ گل اپنے معشوقوں کو آخری الودع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی

زمرد نے خوش ہو کے کہا ”اب ہم اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ اس وادی میں بھائی موسیٰ مارے گئے اور یہیں کہیں ان کی قبر بھی ہو گی“۔ یہ کہہ کے زمرد ایک نازک بدن اور چست چالاک ہر فی کی طرح چاروں طرف دوڑی اور ایک بڑے پتھر کے پاس ٹھہر کے چلانی ”آہ! یہی میرے بھائی کی قبر ہے“۔

اس آواز کے سنتے ہی حسین اُدھر دوڑا گیا اور دیکھا کہ ایک چٹان پر موسیٰ نام گھدا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی چند پتھروں کو برادر کر کے ایک قبر کی صورت بنادی گئی ہے۔ دونوں نے یہاں کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی۔ مگر زمرد کے دل پر حسرت و اندوه کا اس قدر غلبہ ہوا کہ عاشر ہونے سے پہلے ہی وہ گر پڑی اور قبر سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بہت سچھ تسلی دی، نہر سے پانی لا کے منہ ڈھالایا اور رات کے اندھیرے میں اپنی ہو روش معشووقہ کو اپنی گود میں لے کے بیٹھا اور سمجھا نے لگا۔

زمرد: (ہچکیاں لے لے کے) حسین مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مردی ہے۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے ہیں۔ کلیجے میں میٹھا میٹھا درد ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر مرنے سے پہلے تم سے ایک وصیت ہے۔ میں مر جاؤں تو میری لاش کو بھی انھی پتھروں کے نیچے جہاں بھائی موسیٰ کی ہڈیاں ہیں، دبادینا۔

حسین: (نہایت مستقل مزاجی سے، آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پی کر) یہ وصیت اگر پوری ہونے والی ہو گی تو کسی اور کے ہاتھ پر پوری ہو گی۔ میں تمھارے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس کے ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہو گی وہ تمھارے ساتھ میری ہڈیوں کو بھی انھی پتھروں کے نیچے دبائے گا۔

زُمُرِد : (خوشنامد کے لبھے میں) نہیں حسین۔ ایسا نہ کرنا۔ تم کو بھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چیز یہاں سمجھنے لائی۔ نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھائی کی محبت نے اور نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یعقوب کے بیان میں کوئی جادو تھا۔ مگر جس روز اس نے بھائی موی کی حضرت نصیب داستان سنائی، اس کے دوسرے ہی دن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے بھائی اس وادی میں کھڑے ہیں۔ خواب ہی میں انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا یا اور تاکید کر کے کہا کہ میری قبر پر آ کے فاتحہ پڑھ۔ مرحوم بھائی نے کچھ ایسی مُوثر وضع سے بلا یا تھا کہ ان کی اُس وقت کی صورت اس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں یہاں بھائی کی بُلائی ہوئی آئی ہوں۔

حسین : (ونور گر یہ سے بے اختیار ہو کے اور بے انتہا جوش کے ساتھ) خیر۔ تمہیں تو انہوں نے خواب میں بلا یا ہے اور تم مجھے خود اپنے ساتھ لائی ہو۔

زُمُرِد : ہاں۔ میں تم کو ساتھ لائی ہوں، اور اسی سبب سے کہ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ اور میری تمنا ہے کہ تمہارے پہلو میں تمہاری آنکھوں کے سامنے جان دوں۔ اس کے بعد تم گھر جاؤ اور وہاں عزیزوں اور شہر کے دیگر ٹھیر فا کے نزدیک میری جوبے عزتی ہوئی ہے، اُس کو دور کرو، اور میری خبر مرگ کے ساتھ جا کے بتاؤ کہ میں نے کیوں اور کہاں جان دی اور مرتے وقت تک ایسی ہی پاک دامن تھی۔ (گلے میں باہیں ڈال کے) حسین! میری آرزو ہے کہ تم زندہ رہو اور میرے دامن سے بدنامی کا دھنبا دھوؤ۔

ناگہاں ایک پہاڑی کی ڈھالو سطح پر کچھ روشنی نظر آئی جس پر پہلے زُمُرِد کی نظر پڑی اور اُس نے چونک کے کہا ”یہ روشنی کیسی؟“ حسین نے بھی اس روشنی کو حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ”خدا جانے کیا

بات ہے! اور دیکھو، ادھر بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس رات کی تاریکی میں یہاں آنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں!

دونوں عاشق و معشوق روشنی کو گھبرا گھبرا کے ساعت بہ ساعت زیادہ متھر ک ہوتے دیکھ رہے تھے کہ وہ بالکل قریب آگئی۔ بڑی بڑی پندرہ بیس مشعلیں تھیں اور ان کے نیچے حسین و پری جمال عورتوں کا ایک بڑا غول، جن کی صورت دیکھتے ہی زمرہ اور حسین دونوں نے چخ ماری۔ دہشت زدگی کی آواز میں دونوں کی زبان سے نکلا ”پریاں“!
اور دونوں غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔

۱۔ مُلِحَدَ کی جمع۔ بے دین لوگ۔ مُراد باطنیہ فرقے کے لوگ۔

۲۔ مسلمانوں کے بعض فرقے جو خلافت عباسیہ کے دور میں نمودار ہوئے۔ ان کی نوعیت سیاسی تھی لیکن انہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ان میں ایک فرقہ اسماعیلیہ تھا جس کے رہنماء حسن بن صباح نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے ۱۰۹ء میں ایک دہشت پسند جماعت بنائی اور کوہ البرز (ایران) کے قلعہ الموت کو اپنا گڑھ بنایا کہ اسلامی ملکوں میں اپنے فدائیوں کے ذریعے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔

پیاری زمرد ۔۔ تو کہاں گئی!

بہ مے سُجا وہ رنگیں ، کن گرت پیر مغاں گوید

صحح کا وقت تھا اور نسیم کے جھونکے چل رہے تھے کہ مرغانِ سحر نے اپنے اپنے شیموں سے نکل نکل کے حسین کو خواب بے ہوشی سے جگایا۔ نمار کی تی کروٹیں بدلتے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور چاروں طرف مژمر کے دیکھا مگر زمرد کا کہیں پتا نہ تھا۔ جب معاشو قہ داڑ بَا کی محبت بھری صورت کسی طرف نظر نہ آئی تو لیکا جادھک سے ہو گیا۔ ناتوانی اور سر پھرنے کی وجہ سے کئی دفعہ گر کر اٹھا اور اڑ کھڑا تا ہوا چا، آس پاس ہر جگہ دیکھا، ہر طرف نظر دوڑا دوڑا کر ڈھونڈا لیکن ناز نیں و ناز آفرین زمرد کا نام و نشان نہیں۔ آخر ہر طرف سے ما یوس ہو کے اور جستجو میں تھک کے موی کی قبر کے پاس آ کے بیٹھ گیا اور نہایت ہی حرست و اندوہ کے عالم میں آنسو بہا بہا کے کہنے لگا:

”پیاری زمرد! تو کہاں گئی؟ آہ! آسمان و زمین کھا گئے یا رات کی پریاں تجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں؟“ اتفاق سے موی کی قبر پر نظر پڑی اور دیکھ کے متوجب ہوا کہ قبر کچھ بدلتی ہوئی ہی ہے اور دو ایک پتھر زیادہ ہیں جو شام تک نہ تھے۔ حیرت کم نہ ہوئی تھی کہ اس چٹان پر نظر گئی جس پر موی کا نام کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کتبے میں بھی کچھ تغیر دیکھ کے غور سے پڑھنے لگا۔ کسی قدر بلند آواز میں اس کی زبان سے انکا ”موی اور زمرد“ اور اس کے ساتھ ہی چیخ مار کر پھر بے ہوش ہو گیا۔ غم و اندوہ کے فوری جھٹکے پر طبیعت پھر غالب آئی، ہوش آیا اور دل میں کہا ”فسوس! وہی ہوا جو زمرد کہتی تھی۔ وہ مر گئی اور میں زندہ ہوں۔ آہ! پریاں شرح المتصیں۔ پھرتی سے اسے مار ڈالا۔ مجھے نیم جان چھوڑ گئیں۔ آہ! وہ میری جان تھی۔ پھر اس کے بغیر کیوں زندہ ہوں؟“۔ یہ کہہ کر اسی چٹان سے سر

ٹکرانے لگا جس پر دونوں بہن بھائی کے نام کندہ تھے۔ دل میں آئی کہ قبر کھول کے اپنے آپ کو بھی اُس میں دفن کر دے، بلکہ اس ارادے سے چا تھا کہ مذہب کے فرشتے نے کان میں کہا ”یہ دین کے خلاف اور مرنے والوں کی تو ہیں ہے“۔ فرشتہ غیب کی آواز سنتے ہی اس نے زور سے چلا کے کہا ”ٹو پھر میں کیا کروں؟“ یہ کہہ کر زمین پر گر پڑا، اور تڑ پنے لگا۔ دیر تک تڑ پنے اور نالہ وزاری کرنے کے بعد اٹھا اور دوڑ کر موی کی قبر سے لپٹ گیا۔ اب وہ اسے زمرد کی قبر سمجھتا تھا اور جس طرح کوئی زندہ شخص کسی طرف متوجہ ہو کے با تیس کرتا ہے، اسی طرح اس قبر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا:

”پیاری زمرد، مرننا اپنے اختیار میں نہیں، خود کشی حرام ہے اور جینا بے سود بے مزہ۔ لیکن کب تک؟ مرننا برحق ہے اور موت ایک دفعہ ضرور آئے گی۔ پھر اس کا انتظار اسی جگہ کیوں نہ کروں۔ زندگی ان باقی دنوں میں تیری قبر میری مونس و جلیس ہو گی اور تیرا خیال میرا با فام عشوق۔ بس اب میں یہیں رہوں گا اور یہیں مروں گا۔ ہائے! جس طرح تیرے بھائی نے تجھے اپنے پاس بُلا لیا، اسی طرح ٹو مجھے بُلا لے۔ تیری وصیت مجھ سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اب میں یہیں کا ہوں۔ کیا عجب کہ پریوں کا پھر کبھی ادھر گز رہو۔ وہ آسانی سے مجھے تیرے پاس پہنچا دیں گی۔“

دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد حسین کو کسی قدر تسکین سی ہو گئی۔ قبر پر سے اٹھ کے نہر کے کنارے گیا، پر نام آنکھوں پر پاک و صاف پانی کے چھینٹے دیے، وضو کیا اور قبر کے برابر کھڑے ہو کر چند نفل رکعتیں ادا کیں۔ پھر بیٹھ کر انہائی خضوع کے ساتھ زمرد کے لیے دعائے مغفرت کرنے لگا اور ہمیشہ کے لیے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

حسین نے کچھ ایسے مضبوط دل سے اپنے لیے یہ زندگی اختیار کی تھی، اور موت کی دعا مانگنے یا جاں

ستاں پر یوں کے انتظار میں اسے کچھ ایسا مزہ ملنے لگا تھا کہ اب اسے نہ وطن یاد رہانے وہ ارادہ نج۔ زمرد کا خیال اس کا قبلہ اور مشترک قبراس کی مسجد۔ گھاس پات اور کبھی کبھی چڑیوں کے شکار پر بسر ہوتی ہے اور پیامِ مرگ کا ہر گھری انتظار رہتا ہے۔ جب کبھی اندوہ غم کا زیادہ نجوم ہوتا ہے تو اپنی ناز نین معشوقہ کی قبر سے لپٹ کے اور رو رو کے دل کی بھڑاس نکال ڈالتا ہے۔

اسی حالت میں رہتے اور موی اور زمرد کی تربت کا مجاور بننے اسے چھ مہینے گزر گئے۔ جاڑوں کا پُورا موسم انھی پہاڑوں پر بسر ہوا، جہاں ایک عرصے تک ان مظلوم شہید ان حسرت کی قبر پر بر ف کی چادر چڑھی رہی۔ موسم کی سخت سردی اور بر ف باری اس نے صبر و شکر کے ساتھ جھیل لی۔ اب بہار کا زمانہ ہے اور ہر طرف پہاڑوں کی پہلو نشین وادیاں، اور یہ سارا مرغزار پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہوا کے جھونکے ہمیشہ معطر و مشکبار رہتے ہیں اور دل کا اولہہ ساعت بساعت زیادہ بڑھتا جاتا ہے۔ حسین کا غم اب پہلے سے زیادہ جوش و خروش پر ہے اور ان ظالم پری وشوں کے انتظار میں بے صبری اور بے چینی پیدا ہو چلی ہے۔ روز رو رو کے کہتا ہے ”افسوس! موی اور زمرد کا کام تو پر یوں نے ایک ہی دن میں تمام کر دیا اور میں ایسا بد نصیب ہوں کہ انتظار ہی انتظار میں چھ مہینے گزر گئے اور وہ گویا ادھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔“

ایک دن وہ صحیح کوسو کے اٹھا تو خلافِ معمول زمرد کی قبر پر ایک کاغذ پڑا۔ حیرت و شوق سے دوڑ کے اُسے اٹھایا اور پڑھا تو چند لمحے تک نقشِ حیرت بنا کھڑا رہا۔ بار بار تحریر کو غور کر کے دیکھتا اور کہتا ”کہیں نگاہ غلطی تو نہیں کر رہی ہے؟“ مگر ساعت بساعت یقین ہوتا جاتا کہ خاص زمرد کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اس خط کی عبارت یہ تھی:

حسین! میں اس عالم میں نہایت ہی خوش ہوں۔ یہاں کی مسرت تیرے وہم و قیاس سے باہر ہے۔

میں اسی باغ میں ہوں جس کا قرآن اور تمام کتب سماویمیں ہر مسلمان اور خدا شناس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ سب لذتیں مجھے خدا کی مہربانی سے حاصل ہیں۔ زہرہ و مشتری جن کی شعاعیں تجھے دور سے نظر آتی ہیں، میری انیس و جلیس ہیں۔ ان کا قصہ تو نے سنائے مگر یہ نہیں جانتا کہ اس عالمِ نور اور اس مرکزِ راہوں کی مسّرتیں کتنی لفڑیب ہیں کہ انھیں ہاروں و ماروں کی جانبازی کا خیال بھی نہیں آتا۔ مگر میں یہاں بھی تیرے لیے حیران اور تجھے سے ملنے کی مشتاق ہوں۔ فرشتوں اور دیگر روحوں کے ذریعے سے مجھے برادر معلوم ہوتا رہا کہ تو میری قبر کا مجاور بنایا بیٹھا ہے۔ وہ ماڈی کشش جو ایک عرصے تک روح کو عالمِ عناصر کی طرف متوجہ رکھتی ہے، مجھے بارہا میری قبر پر لے گئی۔ میں نے تجھے اپنی قبر سے لپٹ کے روتے دیکھا اور خود بھی تیرے ساتھ گھنٹوں کھڑی رویا کی۔ مگر افسوس! نہ تیری دنیاوی آنکھیں میری صورت دیکھ سکتی تھیں اور نہ تیرے مادی کا نہ میرے رونے کی آوازن سکتے تھے۔ تو ناحق موت کا منتظر ہے۔ ابھی تجھے بہت دنوں دنیا میں رہنا ہے۔ وہ وقت دور ہے جب کہ مجھے تیرے وصال کی خوشی حاصل ہو گی۔ وہ باغِ جہاں ٹو ہے، پر یوں کا نیشن ہے، مگر تیرے سبب سے وہ وہاں نہیں آ سکتیں۔ اور چونکہ ابھی تیرے مرنے کا وقت نہیں آیا، لہذا تجھے قتل بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ کسی طرح اپنی تفریح گاہ کو تجھے سے خالی نہیں کر سکتیں۔ مجبوراً خود انھی کو اپنا نیشن چھوڑ دینا پڑا۔ افسوس! تو نے میری وصیت پر عمل نہ کیا۔ بد نام کرنے والے اور میرے نام پر تہمت لگانے والے اسی طرح ذلیل کر رہے ہیں۔ ان کے افتر اور طور مار مجھے بہت ستاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں تجھے پھر اپنی وصیت یا دلالاتی ہوں اور نہایت ہی آرزو کے ساتھ کہتی ہوں کہ جا اور میری وصیت پوری کر۔ تجھے سے دور اور تیری دلدادہ زمرد حسین نے ہزار ہادفعہ اس خط کو پڑھا۔ اس کی طرزِ تحریر، خط اور الفاظ کو غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کے دیکھا۔ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا مضمون ہے۔ ایک دفعہ گھبرا کے بولا ”کیا زمر دزندہ ہے؟“ پھر آپ ہی کہنے لگا ”نہیں، ممکن نہیں۔ وہ خود ہی لکھ رہی ہے کہ دوسرے عالم میں ہے اور فردوس بریں کی سیر کر رہی ہے۔ پھر یہ خط کیوں کر آیا اور کون لایا؟“؟ دیر تک غور کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پہلے دل میں آئی کہ زمر دکی ہدایت کے موجب گھروالا پس چلا جائے مگر پھر آپ ہی بولا ”نہیں، بالکل بے حاصل ہو گا۔ اول تو وہاں تک جایا کس سے جائے گا اور بالفرض جاؤں بھی تو اس قصے پر یقین کے آئے گا۔ سب مجھے ٹھھلا کر بے وقوف بنائیں گے۔ میں نہیں جا سکتا۔“ اب تو عہد کر چکا ہوں کہ زندگی کی سب باقی ماندہ دن اسی قبر اور زمر دکی یادگار کے پاس بس رکروں گا۔ زمر د کہتی ہے کہ مجھے ابھی بہت دنوں ایڑیاں رکڑنا ہے۔ بہتر ہے۔ رکڑوں گا اور جہاں تک جھیلا جائے گا جھیلوں گا۔ اس جگہ ایڑیاں رکڑ نا بھی زمانے کی خاک چھاننے سے اچھا ہے۔ افسوس! زمر دل میں خفا ہو گئی کہ اب بھی میری وصیت پوری نہ کی۔ لیکن میں غدرات پیش کیے دیتا ہوں۔ جو فرشتے میری روز روز کی خبر اس تک پہنچاتے ہیں، میرا غد ر بھی گوش گزار کر دیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت وہ کھڑی مجھے دیکھ رہی ہو۔ میری با تیں اپنی کانوں سے سن رہی ہو۔ ممکن ہے کیا معنی، بالکل قرین قیاس ہے۔ اب اپنے خط کا جواب سننے کے لیے اس کی روح اس وقت یہاں ضرور آئی ہو گی۔ ہاں، تو جو کچھ کہنا ہے، اسی سے کہوں۔“

یہ خیال اس کے دل پر جنم گیا اور زمر دکی قبر کی طرف دیکھ دیکھ کے یوں کہنا شروع کیا ”پیاری زمر د! نہ میں اس قبر پر نور میں ہوں جہاں تو ہے اور نہ میرے پاس وہ نورانی نامہ بر ہیں جو مجھ خاکی پیکر کا خط تیرے پاس پہنچا دیں۔ اپنی نورانی اور نوری تو جسے کام لے اور خود میری زبان سے غدر سُن۔ حور و ش اور مقبول الہی ناز نہیں! اور غواصِ دریائے رموزِ وحدت اور کثرت! کیا عجب کہ اپنے

نور اور تحریر کی آنکھوں سے تو میری اس وقت ستم زدگی کا تمثاشاد بیکھر رہی ہو یا یہ میری آہ وزاری کی جگہ دوز آواز تیرے روحانی کانوں تک پہنچ رہی ہو۔ زمردا مجھے ان لوگوں کے پاس نبھیج جن کے فہم وادرائک سے تیری روحانیت اور تیری مقبولیت و معصومیت کا قصہ بالاتر ہے۔ وہ میرے کہنے کا یقین نہ مانیں گے۔ لہذا اپنے عشق میں مجھے اس ذلت و رسوانی سے بچا اور اگر بارگاہِ لمبیز میں تیری آواز کچھ بھی اثر رکھتی ہو تو مجھے کوشش کر کے اپنے پاس بُلا لے اور ان پر یوں کو جلدی بھیج کر وہ اپنی تفریح گاہ کو مجھ سے خالی کرالیں میری روح تیرے شوق میں ذبح کیے ہوئے ایک طائر کی طرح تڑپ رہی ہے اور اس ناری پنجرے سے نکلنے کے لیے پھر کتی ہے۔ محبت والی ناز نیں! مجھے اور کہیں نہ بھیج بلکہ اپنے پاس بُلا۔“

اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے کرتے حسین کا جوش اس قدر بڑھ گیا کہ بے تاب ہو کے زمین پر گرا اور لوٹنے اور تڑپنے لگا۔ اور جب جب ناتوانی زیادہ ہوئی تو قبر سے لپٹ کے بے ہوش ہو گیا۔ اب اس خط نے اس کا جوش بڑھا دیا تھا اور اس کے دن پہلے سے زیادہ غم و اندوہ میں گزر رہے تھے۔ زمرد نے عالم پرستان سے جو مُراست کی تھی، اُس نے دل کے جذبات کو یک یک ابھار دیا۔ روز جنت نشین معشوق کو خواب میں دیکھتا اور روز ایک نیا خیال پیدا ہوتا۔ شاید عالم آخرت کا اتنا علم و یقین کسی مسلمان کو کم ہو گا جتنا کہ فی الحال حسین کو تھا۔ دنیا اس کی نظر میں ہیچ تھی۔ وہ اپنے آپ کو عالم نور و ظلمت کے مابین ایک برزخ میں پاتا اور بے خبری اور خود فراموشی کے ساتھ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس مادی اور جسمانی جامے کو چاک کر کے عالم نور میں جا پہنچے۔ اس حالت کو بھی ایک مہینہ ہو گیا، جس کی ہر گھری زمرد کے کسی نئے خط کے انتظار میں گزر رہی تھی۔ آخر انتظار کا زمانہ ختم ہو گیا اور ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا: ”اے محبوسِ ظلمت کدہ ارض! میری جستجو میں تو حد سے گزر اجا تا

ہے اور یہ نہ سمجھ کہ مجھ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میرے تعلقات تیرے ساتھ وابستہ ہیں اور یہی سبب ہے کہ اس عالم میں بھی جہاں ہر طرف سے مسّرتیں ہجوم کیے ہوئے ہیں اور خداوند جل و علا نے ایک خاص بعید از فہم و ادراک لذت میرے دل میں پیدا کر دی ہے، میں تیری طرف سے اپنا خیال نہیں ہٹا سکتی۔ تیری یاد میں یہ روحانی لذتیں بھی میرے دل سے کاٹنے نہیں نکال سکتیں۔

”خیرا بُ ٹو نے پورا امتحان دیا ہے اور کوئی چیز تیرے دل سے میرا خیال نہیں نکال سکتی، تو ما یوس نہ ہو اور مجھ سے ملنے کا سامان کر۔ یاد رکھ! یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں تو مجھے پاس کے گا۔ میں تجھ سے قریب بھی ہوں اور دُور بھی ہوں۔ لیکن جس دروازے سے ٹو میرے پاس آ سکے گا وہ بہت فاصلے پر ہے اور وہاں تک تو بڑی محنت و ریاضت سے پہنچ سکے گا۔ اس کام کے لیے تجھے نفس گشی اور ریاضت بھی کرنا ہوگی اور بڑے بڑے سفر بھی کرنا پڑیں گے۔ اس طرح بے مر شد و رہبر پہاڑوں سے ٹکرانا بے سود ہے اور نہ اس رو نے دھونے سے کچھ اثر ہو گا۔ اگر مجھ سے ملنے کا شوق رکھتا ہے تو اس وادی سے نکل اور کوہِ جودی کی مغربی پہاڑیوں میں جا۔ وہاں ایک بڑا غار ہے جس میں بڑے بڑے خدا شناس لوگ چلہ کشی کر چکے ہیں۔ لوگ نہیں جانتے مگر مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا کہ جس غار میں جناب ابراہیم علیہ السلام نے کواکب کے طوع و غزوہ سے فتح عزائم کر کے خدا کو پہچانا تھا، وہ یہی غار ہے۔ اب لوگ اس غار کو ارضِ شام میں بتاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح جھوٹ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچپن شام میں نہیں گزر بلکہ اس سرز میں میں جہاں ان کا وطن تھا اور جہاں نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہر نے کے بعد ان کی نسل سکونت پذیر ہو گئی تھی۔ اس غار میں تو چالیس دن تک بیٹھ کے چلہ کھینچ اور کوشش کر کے اس مددت میں ہر چوتھے دن صرف تھوڑی سی بناتی قوتِ لا یُمُوت پر زندگی بسر کر۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پورے چلے بھر صرف ایک صورت تیری نظر کے

سامنے ہو اور صرف ایک خیال تیرے دل میں ہو۔ وہ صورت تو میری ہے اور خیال ان مُرشد کے ملنے کا جن کے مُریدوں میں شامل ہونے کوٹو غار سے نکل کے روانہ ہوگا۔ اس چلے کی تنہائی میں تو اکثر دیکھے گا کہ میں تجھے اپنی طرف بُلا رہی ہوں۔ مگر خبردار! اس خیالی پیکر کے دھوکے میں نہ آنا۔ کہیں ذرا بھی تیرے قدم کو لغزش ہوئی تو سمجھ لے مجھ سے ملنے کی کوئی امید نہیں۔

چالیس دن کے بعد پچھلی رات کو اس غار اور کوہ وجودی کی گھاٹیوں سے سر زمین شام کو روانہ ہوا اور بغیر اُس کے کسی اور جگہ مقام نہ کرے۔ بخط مستقیم شہر خلیل میں جائے۔ وہاں کے مشہور تھے خانے میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے جنازے رکھے ہوئے ہیں۔ لوگوں سے آنکھ پھا کر اُتر۔ لوگ تجھے روکیں گے۔ مگر ایسی کوشش کر کے نگہبان اور مجاہدوں کو خبر نہ ہو اور تو اندر پہنچ جائے۔ چالیس دن تک ان دونوں جنازوں کے درمیان بیٹھ کر چلہ کھینچ۔ پھر وہاں سے نکل کر شہر حاب کو جا۔ وہاں محلہ رامنہ کے عقب میں تجھے ایک چھوٹی سی مسجد ملے گی جو مسجد الشمانیں کہلاتی ہے۔ اس مسجد میں جا کے ٹھہر۔ دوسرے ہی دن نمازِ فجر کی جماعت میں ایک شخص آئے گا جو صوف کے کپڑے پہنے ہوگا۔ اس کے بال لمبے ہوں گے اور ایک سیاہ کملی میں اپنا سارا جسم چھپائے ہوگا۔ اس شخص کی چھوٹی سی ڈاڑھی میں نصف سے زیادہ بال سفید نظر آئیں گے اور اس کا عمameہ سبز ہوگا۔ اس لیے کہ سادات بنی فاطمہ سے ہے۔ اس نورستان میں اگر چہ وہ اور کسی خطاب سے یاد کیا جاتا ہے مگر اُس عالمِ عناصر میں اُس کا نام شریف علی وجودی ہے۔ یہ شخص اگر چہ بالکل منکرانہ مزاج وضع کیے نظر آئے گا مگر اس کی آنکھوں سے ریاضت و نفس کشی اور جذبات روحانی زیادہ ہونے کی وجہ سے شعلے نکلتے ہوں گے۔ خوب یاد رکھ کہ جب تک ٹو شریف علی وجودی کے سامنے نہ جا پہنچے گا، وہ تیری طرف توجہ نہ کریں گے۔ ان بتائی ہوئی نشانیوں سے تو انھیں پہچان

سکے گا۔ اُن سے میرا خواست گارہونا۔ وہی شخص تجھ کو مجھ سے ملا سکتا ہے اور اُسی کے ہاتھ میں ہماری کامیابی ہے۔ اگر تو میرا شیدا اور آرزومند ہے تو جب تک مقصد برآ ری نہ ہو شیخ کی خدمت اور غلامی کرنا۔ اگر تو پورے ایک سال تک شریف علی وجودی میں رہے گا تو کوئی ایسا موقع ضرور پائے گا جب کہ وہ ایک جوش اور ولوں میں آ کے انسان کو ملا علی کی سیر کرادینے کا دعویٰ کریں گے۔ دعویٰ سنتے ہی ان کے قدموں میں گر کر اپنی دلی آرزو ظاہر کرنا۔ وہ بے شک منظور کریں گے۔ مگر اس کا خیال رہے کہ شیخ کے ہر حکم کی تعمیل، خواہ تیری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بے ٹرد را اور بلا تجھت کرنا:

بے م سجادہ رنگ میں گن گرت پیر معاں گوید

اگر یہ سب مراحل ٹو نے طے کر لیے اور شیخ کی اطاعت میں پوری سرگرمی اور گرم جوشی دکھادی تو جان لے کہ میرا آغوش تیرے لیے کھلا ہوا ہے۔ تجھ سے زیادہ میں تیرے لیے حیران ہوں، بس اب جلدی اُس وادی میں پہنچ اور میری قبر کو چھوڑ اور مجھ سے ملنے کی کوشش میں استقلال و مستعدی دکھا۔

تیری مشتاق و شیدا زمرد

حسین اپنے جوشِ محبت میں احباب سے تنفر ہو جانے کی وجہ سے زمرد کی پہلی وصیت اور اُس کے بعد گزشتہ خط پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس خط کے بعد ممکن نہ تھا کہ گھڑی بھر کے لیے بھی اس وادی میں ٹھہر سکے۔ زمرد کی محبت و وفا شعاری یاد آئی اور نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ زمرد کی قبر سے رخصت ہوا۔

تگ و تار یک گھائی سے بیزار دشواری سے سنبھل سنبھل کے نکلا اور اسی مقام پر پہنچا جہاں اپنے اور

زمرد کے گدھوں کو درختوں سے باندھ کے چھوڑ گیا تھا۔ دونوں گدھے بندھے سُوكھ سُوكھ کے، سردی و برف باری کے صدمے اٹھا کے مر گئے تھے۔ ان کی ہڈیاں درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کے نہایت ہی متاخر ہوا کہ قدیم گدھے کے بد لے اب ایک اور تازہ دم گدھا اس درخت میں بندھا اور کسا کھڑا ہے۔ خلافِ امید اس سواری کو پا کے اُس نے خداوندِ کریم کا شکر ادا کیا جس نے عالمِ نور کے بہت سے رُموز اس دنیا ہی میں اس پر ظاہر کر دیے، اور آگے کی راہ لی۔ جہاں تک راستہ خراب اور پیچیدہ تھا، وہاں تک تو وہ گدھے کا دہانہ پکڑے ہوئے پا پیا دھیا۔ جب صاف اور کشادہ زمین آگئی تو اس خدا کی دی ہوئی سواری پر سوار ہو کے سیدھا مغرب کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چونکہ اس کو ہستان کا سلسلہ بھی مشرق سے مغرب کو گیا ہے، لہذا اس کے دامن میں بادیہ پیائی شروع کی اور دو مہینے کی دشت نوری کے بعد علاقہ آذربائیجان کے شہر تبریز میں جا پہنچا، جہاں سے کوہِ جودی دس بارہ دن کی مسافت پر ہے۔ تبریز ایسا بارونق شہر تھا کہ حسین کے دل میں آئی کہ دو دن ٹھہر کے سیر کرے۔ مگر زمرد کی تاکید یاد آئی اور بغیر اس کے کہ کارواں سڑائے میں کمر بھی کھولی ہو، آگے کی راہ لی اور دس روز دشت نوری کے بعد کوہِ جودی کی سرفلک چوٹی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

کوہِ جودی بہت بلند پہاڑ ہے، اور ایران اور ایشیائے کوچک بلکہ سلسلہِ کوہِ قاف کی اکثر چوٹیوں سے زیادہ بلند ہے۔ حسین پہلے ایک بڑا چکر کھا کے اس زبردست اور برف سے ڈھکے ہوئے قلعے کے مشرقی پہلو پر نکل گیا اور اُس غار کو ڈھونڈنے لگا جس میں اُسے چلہ کشی کرنا تھی۔ کئی روز تک چٹانوں اور گھاٹیوں میں ٹکراتے رہنے کے بعد وہ غار ملا۔ دور دور کے گاؤں والے اکثر اس غار کی زیارت اور اس کے تاریک دہانے پر کچھ نہ کچھ چڑھانے کو آتے رہتے تھے۔ لوگوں میں اس کی

قدیم برکتوں کے بہت سے قصے مشہور تھے اور یہود و نصاریٰ و مسلمان سب اُس کی حرمت اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھی گاؤں میں ایک زائر کی زبانی حسین کو غار کے حالات معلوم ہوئے اور سمجھ گیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسے اپنی ریاضت اور نفس کشی کا پہلا امتحان دینا ہے اور جہاں جناب ابراہیم علیہ السلام نے خدا کو پہچانا تھا۔

دن کو جب حسین اس غار کے دہانے پر پہنچا، وہاں اضالع جو دی ولبنان کے چند خوش عقیدہ زائروں کا مجتمع تھا۔ شام کو ان کے واپس جانے کے بعد جیسے ہی آفتاب غروب ہوا، وہ خدا کا نام لے کر اندر گھسا۔ غار میں جاتے ہی ریاضت میں مشغول ہو گیا اور کوشش کرنے لگا کہ وہاں کی بھیانک تاریکی میں زمرد کی خیالی تصویر کا چراغ بنائے ہو رہا۔ اسے ہر وقت نظر کے سامنے رکھے، چوتھے دن پچھلی رات کونکل کے گھاس اور پتوں سے بھوک کی خدمت کم کر لیتا اور پھر اسی خلوت کدے میں جا بیٹھتا۔

آخر چلے پورا کر کے پری وش نوجوان نے شام کی راہ لی۔ تین مہینے کے سفر کے بعد مقدس شہر خلیل کی عمارتیں ناظروں کے سامنے تھیں۔ آبادی میں داخل ہو کے سیدھا اس تھا نے پر پہنچا، مگر یہاں نیچے اترنا بہت دشوار تھا۔ اس لیے کہ ہر وقت لوگوں کا مجتمع رہتا اور خرابی یہ تھی کہ جو کوئی اس مقدس غار میں اترنے کا ارادہ کرے، پہلے اجازت لے۔ لہذا عام مجاورین کو دوست بنا کر اجازت حاصل کرنے کے لیے راستے کے قریب ہی شب باش ہوا۔ کئی راتیں جاگ کر کاٹیں مگر موقع نہ ملا۔ اس لیے کہ اکثر لوگ یہاں پاس ہی شب بیداری کرتے تھے، اور ایسا کوئی وقت نہ ملتا جب کہ لوگ مصروف دعا و عبادت نہ ہوں۔ دو تین ہفتے کے بعد ایک مرتبہ پچھلی رات کو اٹھ کے دیکھا تو میدان صاف تھا اور جو لوگ تھے، وہ سور ہے تھے۔ 'چکے' چکے دبے پاؤں تھے خانے کے دروازے پر گیا

اور چاروں طرف دیکھ کے اطمینان کر لیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو بے تکلف نیچے اتر گیا۔

اس مقام پر جانا بڑی جرأت اور ہمت کا کام تھا۔ ان انبیاء نے عظام کا رُعب ساعت بساعت دل پر غالب آتا جاتا تھا۔ پاؤں کا نپ رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔ تاہم زمر د کا شوق ان تمام دلی کمزوریوں پر غالب آیا۔ وہ برابر بڑھتا چلا گیا۔ بار بار اسے معلوم ہوتا جیسے فرشتے روک رہے ہیں کہ اس مقدس جگہ کو اپنے قدموں سے ناپاک نہ کر۔ مگر ان سب خیالات کو مٹا مٹا کے وہ گھٹائوپ اندھیرے میں ہاتھوں اور پاؤں سے ٹوٹا ہوا تھا تک پہنچ گیا۔ رات کا وقت اور پھر وہ تاریک مقام، حسین پہنچ کر پریشان ہوا کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا، بزرگ پیغمبروں کے جنازے کیونکر نظر آئیں گے۔ عرصے تک ایک ہی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ اب دل کو مضبوطکر کے آمادہ ہوا کہ ٹوٹ کے آگے بڑھے کہ ناگہاں صبح کی شعاعیں اور پر سے پہنچیں اور وہ ٹھہر گیا کہ روزِ روشن ہو لے تو زیادہ آسانی سے اپنے مقصودہ مقام پر پہنچ سکوں گا۔ اور یہی ہوا۔ دن کی روشنی نے اندھیرا کم کر دیا اور اسے کئی لاشیں چبوترے پر کھیں نظر آئیں جن میں سب کے درمیان حضرت یعقوب و یوسف کے جسم تھے۔ ان کا انتقال چونکہ مصر میں ہوا تھا، لہذا قدیم مصریوں کے مذاق پر ان کی ممیاں بنائی گئی تھیں۔ ان کے جسم آئینے کے تابلوں میں تھے، جن سے اس تاریکی میں ایک عجیب رُعب و جلال برستا نظر آتا تھا۔

حسین یہ مقدس چہرے دیکھ کے سر سے پاؤں تک کا نپ گیا۔ کسی طرح قدم آگے بڑھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ چند لمحے تک مرعوب اور سہا کھڑا رہا اور پھر جی کڑا کر کے قدم آگے بڑھایا اور دونوں کے درمیان میں جا کے چپکے سے بیٹھ گیا، جہاں دونوں کے باہیت چہرے ہر وقت اس کے پیش نظر رہتے اور ان کا رُعب اس قدر غالب تھا کہ زمر د کے خیال کو وہ مشکل سے آنکھوں کے

سامنے متشکل کر سکتا تھا۔ مگر کوہ جو دی کے چلے کی کوشش نے وہ پیاری صورت زیادہ استقلال کے ساتھ نظر کے سامنے قائم کر دی اور تھوڑی ہی کوشش سے ان دونوں متبرک چہروں کے درمیان میں وہ اپنی معشوقہ کا جلوہ دیکھ لیا کرتا تھا۔

الغرض یہاں بھی وہ چلہ کشی میں مشغول ہو گیا۔ یہاں کوہ جو دی کے غار کی طرح یہ ممکن نہ تھا کہ کسی وقت نکل کے ٹوٹ لا یہوت حاصل کرے۔ اس کا خیال اُسے پہلے سے تھا اور اس ضرورت سے تھوڑا سا پیروپی چادر میں باندھ کر لیتا آیا تھا۔ دو تین ٹکڑے چوتھے دن کھا کے شکر گزار ہوتا۔ خدا خدا کر کے یہ چلہ بھی پورا ہوا۔ اکتالیسویں رات کو وہ چپکے چپکے اور دبے پاؤں باہر نکلا کہ کسی کوخبر نہ ہو، اور وہ حلب کی راہ لے۔ مگر لوگ جاگ رہے تھے جن میں سے بعض اُسے پہلے ہی دیکھے چکے تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی ٹل مچا کے حملہ کیا اور وہ غار سے نکلتے ہی مجاوروں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ قریب تھا کہ قتل کرڈا جاتا، مگر اتفاق یا اس کی خوش قسمتی سے ایک روز ایک باطنی فدائی کے ہاتھ سے شہر خلیل کا حمران مارڈا گیا تھا۔ لوگ اگرچہ باطنیہ لوگوں سے ڈرتے تھے مگر آخر بڑا اہم معاملہ تھا۔ وہ انتقام کے درپے تھے اور باطنیوں کے ایک گاؤں پر تاخت کرنے کا سامان کر رہے تھے کہ باطنیوں کا ایک بڑا بھاری گروہ خوداں پر آپڑا۔ سخت خون و قتل ہوا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور اسی بے امنی کی حالت میں حسین مجاوروں کی قید سے چھوٹ کر حلب روانہ ہوا۔

آٹھویں دن شام کے وقت حلب میں داخل ہوا۔ راہ گیروں سے پوچھتا ہوا محلہ رامنہ اور پھر مسجد الشمانیں میں پہنچا۔ یہاں آتے ہی کمرکھول دی اور سر شام ہی کچھ کھاپی کے عشاء کی نماز پڑھی اور سو گیا۔ اگرچہ تھکا ماندہ تھا مگر زمرد کے وصال کا شوق سر پر غالب تھا۔ آدھی رات سے زیادہ نہ گزری ہو گی کہ آنکھ کھل گئی اور صبح تک نمازِ فجر کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح کی اذان سے

پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا اور دروازے پر بیٹھ کے ہر آنے والے کی صورت کامٹا لعہ کرنے لگا۔ آس پاس کے مکان والے نیند کے خمار میں لڑکھراتے اور ڈھوکریں کھاتے آتے اور وضو میں مشغول ہو جاتے۔ حسین کو اکثر لوگوں پر شیخ شریف علی وجودی کی صورت کا دھوکا ہوا۔ مگر کسی طرح اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آخر دل ہی دل میں پریشان ہونے لگا اور اپنی طرف خطاب کر کے چمکے سے کہا:

”مجھے یقین نہیں کہ شیخ سے مل سکوں۔“ یہ جملہ اُس کی زبان سے نکلا، ہی تھا کہ اُسی حالیہ و وضع کا ایک شخص آیا، اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر لڑکھرا ہو گیا اور نہایت تسلی و شفی کے لمحے میں بولا حسین، میں جانتا ہوں کہ تو میری تماش میں آیا ہے۔“ اتنا سنبھال تھا کہ حسین ان کے قدموں میں گر پڑا، اور ان کے پاؤں کو اپنے آنسوؤں سے دھوکے کہنے لگا:

”یا حضرت! میری مدد کیجئے! صرف آپ ہی کی راہبری سے مجھے حق کا راستہ مل سکتا ہے۔ جس صراطِ مستقیم پر چل کے انسان خدا اور عالم ارواح کو پہچان سکے، وہ صرف آپ ہی جانتے ہیں۔“

شیخ: (جال میں آ کے) اے بحرِ وجود اور دریائے وحدت کے ذیل و ناپاک قطرے! تیرا کیا حوصلہ ہے کہ اس غیر موجود اور لاہوت غیر منون کے رموز کو سمجھ سکے۔

حسین: بے شک میری کوئی ہستی نہیں۔ مگر جب آپ سے شناور بحرِ وجود کا ہاتھ پکڑ لوں گا تو کیا عجب کہ اس طوفان خیز دریا سے پار ہو جاؤں؟ اور یہ کہہ کہ رو رو کے پھر شیخ کے قدم پھو منے لگا۔

شیخ کا جال کسی قدر کم ہوا۔ انہوں نے حسین کو پکڑ کے اٹھایا اور سینے سے لگایا اور اپنا سینہ کئی دفعہ زور سے اس کے سینے سے رگڑا اور کہا ”اچھا میرے ساتھ چل۔ میں تیرے ضبط و ظرف کا اندازہ کروں گا۔ اور جب معلوم ہو جائے گا کہ تیری طلب کہاں تک صادق ہے، اُس وقت تجھے اپنے حلقة“

ذوق میں شریک کروں گا۔“

حسین نے یہ سن کے شکرگزاری کے طریقے سے سر اٹھایا، شیخ کے ہاتھ کو بوس دیا اور ان کے ساتھ جا کے نماز میں شریک ہوا۔ نماز کے بعد شیخ شریف علی وجودی اپنی خانقاہ میں لے گئے جو شہر سے کچھ فاصلے پر ایک غیر آباد مقام میں تھی۔ حسین کو یہ خیال کر کے تعجب ہوا کہ مسجدِ ثمانیں کو کیا تخصیص ہے کہ شیخ وہاں فجر کی نماز ادا کرنے کو گئے تھے۔ اس کا راز دریافت کرنے کے لیے اس نے ادب کے ساتھ پوچھا کہ حضرت ہر روز نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے ہیں؟

شیخ: (بے پرواہی سے) نہیں۔ صرف آج چلا گیا تھا۔

حسین: تو شاید کسی کام کے لیے اُدھر تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا ہو گا۔

شیخ: (ذرابرہمی سے) لولا تجویز سُوان رموزِ معنی کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ اگر سچا شوق ہے تو کبھی خود ہی سارا راز کھل جائے گا۔ اب حرفِ سوال تیرے منہ سے نکل ہی گیا تو لے بتا دیتا ہوں۔ سن! جو لوگ خدا کے انوارِ ازلی و سرمدی کا انگکاس اپنے دل پر کرتے ہیں، ان کی آنکھوں سے جا ب کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور جہاں جہاں وہ نور ال انوار اپنی کرنیں ڈالتا ہے، وہاں آنکھوں کی شعاعیں بھی پہنچ جاتی ہیں۔ میرا جسم مادی اسی خانقاہ میں تھا مگر ان آنکھوں کی شعاعیں کوہ البرز کے پہلوؤں میں تھیں، جب زمرد کی تصویر تیرے سامنے اور میری جستجو تیرے دل میں تھی۔ پھر یہ شعاعیں اس تیرہ تارثہ خانے میں تھیں جہاں یوسف و یعقوب کے چہروں کے درمیان تو زمرد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے تیری اس بے کسی کو دیکھا جب تو شہرِ خلیل کے مجاوروں کے ہاتھ میں اسیر تھا۔ تیری مدد کے لیے میں نے اپنے دوستوں کو بھیجا جنہوں نے شہروالوں پر حملہ کر کے تجھے اُدھر آنے کا موقع دیا۔ یہ کہتے وقت شیخ کی آنکھیں اس تیزی سے چمکیں کہ حسین بالکل ختم نہ کر سکا اور شیخ کے قدموں پر سر

رکھ کے مجذوبانہ جوش کے ساتھ کہنے لگا:

”آپ سب جانتے ہیں۔ کوئی راز آپ سے پوشیدہ نہیں۔ میری آرز و اور تمنا بھی آپ کو معلوم ہے۔“

شیخ: (جو شوخی سے) سب جانتا ہوں، مگر اس کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔ اس شوق کا تیری زبان سے ظاہر ہونا کسی خاص وقت، خاص حالت و کیفیت پر موقوف ہے۔ بس اب اس وقت خاموش رہنا چاہیے۔

یہ حکم سن کے حسین اس قدر مرعوب ہوا کہ میں پر پڑ کے کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ نے اُسے اٹھا کے بٹھایا، سینے اور آنکھوں پر اپنا دست برکت پھیر کے اُس کے دل کو تسلی دی اور کہا ”حسین! تو میری خانقاہ میں اور خاص میری صحبت میں رہا کر۔ اور جس قدر زیادہ خدمت کرے گا اور جس مستعدی سے بے عذر و حجت میرے احکام کی، جو دراصل احکامِ الہی ہیں، تعمیل کرے گا، اسی قدر جلد کامیاب ہو گا۔ مگر یہ خوب سمجھ لے کہ ابھی تیراظرف اور تیرا دل اس قابل نہیں کہ فتوحاتِ ربّانی اور انقلابِ قدرت کے اسبابِ عمل سمجھ سکے۔ موسیٰ اور حضرت کاظمہ ہر وقت پیشِ نظر رکھا اور یقین کر لے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ نتائجِ ہمیشہ باطن میں مخفی ہوتے ہیں۔ ظاہر پرستِ رموزِ قدرت کو نہیں سمجھ سکتے۔ سزا اور جز اروح کے لیے ہے جو باطن پر متصرف رہتی ہے اور ہمیشہ دل کے اندر اور نیت پر حکمران ہے۔ یہ ظاہری ارکان و جوارح اسی مادے میں مل جائیں گے اور نہیں رہیں گے۔ لہذا ان حرکات کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ قاضی و مفتی جاہل ہیں، نورالانوار یزدانی سے دور ہیں، جو ظاہری افعال و حرکات پر حکم دیتے ہیں۔ خضر و موسیٰ“ کے قصے میں اُس لاہوتِ اکبر نے موسیٰ کی تائید نہیں کی جو ظاہر پرستی کر رہے تھے۔ بلکہ خضر کو موافق فیصلہ کیا جو رموزِ باطنی اور رازِ اخفا

کو سمجھ رہے تھے۔ اسی طرح دیکھو ابراہیم نے بی بی کو بہن بتایا تو ظاہر پرست بہت گھبرائے کہ پیغمبر کی عصمت میں فرق آ گیا۔ یہ ان کی جہالت ہے، خدا ابراہیم کے دل کو دیکھ رہا تھا۔ الحال اے حسین! تو خوب سمجھ لے کہ ہر ظاہر کا باطن ہے اور خدا باطن کا طرفدار ہے، تجھے شیخ اور مرشد کی اطاعت آ نکھیں بند کر کے اسی طرح کرنا چاہیے جیسی اطاعت کی خواہش خضر نے موئی سے کی تھی۔

حسین: (سینے پر ہاتھ رکھ کے) بے شک میں ایسی ہی اطاعت کروں گا۔ مگر کیا معاصلی اور بُرے کاموں کے لیے بے سمجھے ارتکاب کر لینا چاہیے؟

شیخ: (نہایت جال کے ساتھ اور آ نکھیں سُرخ کر کے) کیا تجھے یہ گمان ہے کہ مرشد بُرے کام کا حکم دے گا؟

حسین: (ڈر کے اور اخلاقی کمزوری کی شان سے) لیکن ممکن ہے کہ مرید اور عقیدت کیش کو وہ فعل گناہ نظر آتا ہو۔

شیخ: ہاں، ممکن ہے، مگر اس کا باطن گناہ نہیں اور نتائج صرف باطن پر مرتب ہوتے ہیں۔

حسین: مگر اسی باطن پر جو مرتكب اور کرنے والے کے دل میں ہو۔ میں ایک فعل کا ارتکاب کروں تو اس کے نتائج اسی نیت پر مرتب ہوں گے جو میرے دل میں ہے۔ اگر مجھے اس کا باطنی رُخ اچھا نہیں معلوم ہو گا تو خواہ مخواہ میری نیت بھی بری ہو گی۔ اور جب میری نیت بری ہو گی تو نتیجہ بھی اس نیت کے مطابق بُرا ہونا چاہیے۔

شیخ: (جو ش میں آ کے اور آ نکھیں سُرخ کر کے) تو کیا تیرے نزدیک شیخ کی نیت پر شبہ کیا جاسکتا ہے، اور اس سے پہلے رازِ لہ ہوتی کے تسلیم کرنے سے تجھے انکار ہے؟

حسین: (شیخ کے قدموں میں گر کے) ہرگز نہیں، مگر میری باتیں محض اس لیے ہیں کہ لیتھمکن
قلبی۔ خداوندوہ دن نہ لائے کہ میں شیخ کی نیت پر پھپہ کروں۔

یہ جواب سن کر شیخ نے حسین کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کی پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیر کے کہا ”
سُن! بے شک تیرے دل میں شکوک آتے ہوں گے۔ مگر اس راہِ باطن میں جو قدم آگے بڑھائے گا
، تجھے نظر آئے گا کہ مُر ید کی وقعت کیا ہے۔ سُن! مُر یہ بعینہ ایک توار ہے جس کے قبضے میں شیخ کا
ہاتھ ہے، اور تو سمجھ سکتا ہے کہ توار پڑے اور جس کا سر چاہے اڑا دے۔ مگر الزام یا ظلم کی نسبت
توار سے نہیں کی جاسکتی، مگر یہ چیزیں اسی طرح منسوب ہوتی ہیں جو توار کو ہاتھ میں لیے ہو۔ یقین
ہے کہ اب تیرا شک رفع ہو گیا ہو گا اور تو سمجھنے لگا ہو گا کہ مُر یہ کے انفعال کا باطنی پہلو شیخ کی نیت
سے متعلق ہے، نہ کہ خود مُر یہ کے ارادے سے۔ جب اس طرح اطاعت و مستعدی دکھا کے انسان
ارادت کے مدارج طے کر چلتا ہے، اس وقت اعلیٰ درجے پر پہنچتا ہے۔ لیکن جب تک وہ ارادت
کے درجے طے کر رہا ہے، اس کے ارادوں اور اس کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس وقت تک اس
کے فعل کا ذمہ دار شیخ اور مُرشد ہے۔

حسین: (جو شوخی سے شیخ کا ہاتھ چوم کے) بے شک بجا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے
سے حقیقت کا پردہ اٹھ گیا اور مجھے کسی حکم کی تعمیل میں عذر نہ ہو گا۔

شیخ: حسین! مُر یہ کے سر پر بڑی نازک ذمہ داری ہے۔ اس سے زیادہ نفس گشی کیا ہو سکتی ہے
کہ انسان اپنے دل اور اپنی عقل کو اپنے انفعال سے بالکل الگ رکھے۔ مگر تو غور کرے گا تو معلوم
ہو جائے گا کہ یہ احکامِ الہی اور فتار زمانہ کے بالکل موافق ہے۔ جن کاموں کی تعمیل خضر نے کی
اور جن میں موسیٰ کی مددی، ان کا باطنی پہلو صرف خضر کے دل میں تھا اور موسیٰ کی نیت میں وہ قطعی

معاصلی نہ تھے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ موسیٰ نے گناہ کیا اور اتنے بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں شریک ہوئے۔ ایسا اس لیے کہ اس عالمِ باطنی میں خضرِ مرشد اور موسیٰ مُرید تھے۔ اس کی تعقیل خود ظاہر پرستوں میں روز ہوتی رہی ہے۔ طبیبِ بظاہر نہایت سُنگی دوادیتا ہے اور مریض اگرچہ اس کے منافع سے بے خبر ہے

مگر بالاتائل کھالیتا ہے۔ ماں باپ لڑکے کو کسی کام پر مارتے ہیں۔ لڑکا اس کام کو دل میں اچھا سمجھ لیتا ہے۔ مگر ماں باپ اپنے دل میں اور اپنے ہی خیال کی مُضرت کی تمنا پر مارتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہر ایک کے نزدیک اچھا ہوتا ہے۔

یہ تقریر ایسی موہر تھی کہ حسین اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ لاس کا اور پھر ایک نہایت ہی بے خودی کی وضع سے جوش میں آکے چلا یا ”بے شک! آپ بجا فرماتے ہیں۔ میرے دل کو اطمینان ہو گیا۔ میں کبھی بھی کسی حکم سے سرتاسری نہیں کروں گا۔“

اس علم غیب اور اس مدلل تقریر نے حسین کو شیخ علی وجودی کا ایسا اگر ویدہ بنادیا کہ اُس کی نظر میں سوائے شیخ کے اور کسی چیز کی ہستی نہ تھی۔ اُس کے کانوں میں ہر وقت شیخ کی آواز گونجتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر گھری شیخ کی تصویر پھرتی اور اس کے دل میں ہر لحظہ شیخ کے احکام کا انتظار رہتا۔ زمرد کی تصویر بھی اب اس طرح پیش نظر نہ تھی بلکہ کبھی خانقاہ کے جھرے میں لیٹ کے وہ زمرد کے خیال کی طرف متوجہ ہو کے کہتا ”پیاری زمرد! مجھے تو نے کہاں بھیجا ہے کہ خود مجھے بھولا جاتا ہوں۔“

الغرض اب پورے کمال کے ساتھ اسے فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل تھا۔ اُس کو ارادت و عقیدت مندی کے ساتھ شیخ کی خدمت کرتے بارہ مہینے گور گئے۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ تین مہینے کے لیے

غائب رہے اور کسی ایسے سفر پر گئے جس کا انہوں نے بالکل راز میں رکھا۔ حسین ان کی غیبت میں بھی خانقاہ میں رہا۔ مگر اتنی مدت میں اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ علی وجودی کے مُرید و معتقدین کن کن شہروں میں اور کتنے کتنے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ سال میں ایک مرتبہ دور دراز کا سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نئے نئے عجیب و غریب احکامات سن کرو اپس جاتے۔ جن کی فوری تعمیل ہوتی۔ ایک طرف خراسان، مکران، سیستان، فارس، رو دبار آذربائیجان، عراقِ عرب اور عراقِ عجم کے مُرید آتے اور دوسری طرف عثمان، حضرموت، حجاز، یمن، زنجبار، مصر، طرابلسُ الغرب، الجزیرہ اور تمام علاقہ افریقہ اور ایشیائے کو چک کے معتقد۔ یہ سب لوگ مختلف وضع و لباس میں ہوتے اور پوشیدہ اکثر راتوں کو دیکھتا کہ شیخ کے خوشہ چین اور ارادت مند کن کن اقطای عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور اتنے بڑے اثر اور حکومت کے ساتھ بظاہر وہ کس سادگی اور بے نفسی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک رات شیخ کے گردوس مریدوں کا مجمع تھا۔ حسین بھی نہایت ادب کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھا تھا اور شیخ کی زبانِ فیض ترجمان بہت بڑے بڑے رموزِ حکمتی و روحانی کھول رہی تھی۔ ایک شخص نے جو مصر سے آیا ہوا تھا، ادب سے مگر شک کرنے کے لیے میں کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا، انسان جب اس جسمِ خا کی کو خاکدان میں چھوڑ جاتا ہے تو جنت کی مسروتوں میں اُسے کیوں لطف آتا ہے؟“

اس کے جواب میں شیخ نے کسی قدر برہمی سے کہا ”بعینہ اس طرح کہ تم دنیا میں اس جسم کے ساتھ مزے اٹھاتے ہو۔“

حسین: کیوں کر ہو؟ لذت اور درود تو صرف جسم کے موافق سے ہیں۔

شیخ: (ذر اجوش میں آ کے) روح گوب جسم ہوتی ہے مگر اسے معلوم یہی ہوتا ہے کہ گویا جسم میں ہے۔

شخص: یہ کیوں کر سکتا ہے؟ جب ماڈے کی کثافت ہی نہیں تو اسے متشکل اور متغیر کون چیز کر سکتی ہے؟

یہ سُن کے شیخ کی برهمی اعتدال سے زیادہ ہو گئی۔ انہوں نے حسین کو پکار کے قریب بُلا یا اور کہا ” بتا! تو جب کوہ البرض کی گھاٹی، کوہ جودی کے غار اور شہر خلیل کے تیرہ و تارہ خانے میں تھا، اُس وقت میرے وہاں موجود ہونے اور تیری ہر حالت سے باخبر رہنے کا تھے یقین ہے؟

حسین: (سینے پہ ہاتھ رکھ کر) بے شک، گویا میری ناتوان آنکھیں نہ دیکھتی ہوں، حضرت کا جلوہ ضرور موجود تھا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہاں کے روز آپ کو معلوم ہو سکتے۔

یہ سُن کے شیخ نے ذرا فخر و ناز کی شان سے ارد گرد کے لوگوں کو دیکھا اور سب کے بعد اس شخص کے چہرے پر جس نے یہ شک کیا تھا اپنی تیز نظریں جمادیں۔ مگر اُس کے دل کو ابھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ شیخ علی وجودی کی اتنی برمی دیکھ کچنے پر بھی معتبر صانہ طریقے سے بول اُٹھا ” بے شک آپ وہاں موجود ہوں گے اور حسین کی ہر حالت کو دیکھ رہے ہوں گے۔ مگر صرف آپ کی روح تھی اور متشکل نہیں ہوتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو حسین آنکھوں سے بھی آپ کے نورانی جمال کو دیکھ لیتا۔“

یہ سنتے ہی شیخ کوتا بند رہی۔ زور میں آ کے کھڑے ہوئے، آنکھوں کی چمک دو چند ہو گئی، منہ میں کف بھرا آیا، اور اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا ” یہ جسد ناپاک نہایت ہی سرکش ہے یا روح ہو رالا نوار کے شہو دبا وجود کونہ سمجھ سکتی ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی کو یہ راز بھی معلوم نہیں کہ دنیا کیوں ہے اور یہ روح اس پنجربہ خا کی میں ایک مدت تک کیوں قید رکھی جاتی ہے۔ اس کا

راز مجھ سے سنو! میں وہ شخص ہوں کہ جو سر و شہستان اور عالمِ لاہوت کا ایک آن میں دورہ کر آتا ہوں اور ان روز کو جو عرشِ اعلیٰ کے اطراف میں لکھے ہیں، پڑھ آتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جسم میں آنے سے پیشتر روحِ مجرز دیں صلاحیت نہیں ہوتی کہ کسی مادی مسرت سے لطف اٹھا سکے۔ اس وقت وہ محض مجرز ہوتی ہے اور حظوظ ولذائی سے فائدہ یاب ہونے کے طریقے سے بالکل بے خبر۔ صرف اسی چیز کا سبق لینے کے لیے وہ اسِ جسمِ خاکی میں رکھی جاتی ہے۔ وہ محمد و دزمانہ جسے تم زندگی کہتے ہو اور ہم روحوں کے کمال حاصل کرنے کا مدرس، اس لیے ہے کہ روحِ لطیف اس مادے کے ساتھ علاقوں پیدا کر کے ہر قسم کی لذتوں اور ہر قسم کے المов سے اتنی آشنائی پیدا کرے کہ اس سے علاحدہ ہونے کے بعد بھی جب چاہے اپنے آپ کو متھیر و متشکل اور لذت والم سے متأثر کر سکے۔ جس طرح کوئی شخص مدارج روحانی طے کرنے کے بعد یہ صلاحیت اور قوت حاصل کر لیتا ہے کہ روح اس کے جسم میں رہنے کی حالت میں بھی اپنے آپ کو غائب یا روح غیر متشکل و غیر متھیر بنالے، اسی طرح روح انسانی عموماً اسِ جسمِ خاکی کے مجرے میں بند ہو کے اتنا چلہ کھینچ لیتی ہے کہ اس کے چھوڑ دینے کے بعد بھی جب چاہے اپنے آپ کو جسم اور شکل میں ظاہر کر دے۔ پھر اس کا کمال اس درجہ پڑھ جائے۔ بہت سے باکمال بزرگوں اور شہیدوں کو سنا ہو گا کہ ان کے جسم تو قبر کے کونے میں پڑے سڑ رہے تھے مگر روح اکثر لوگوں کی نظر کے سامنے اپنی ہی یا کسی دوسری شکل میں نمودار ہوئی۔ صرف ایک روح ہے جس نے بغیر جسم میں آئے اس کمال کو حاصل کر لیا۔ اس سے مراد جبرائیل ہیں جو کبھی وجیہ کلبی اور کبھی دیگر پیکروں میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے نمودار ہوئے۔ مگر اس کا راز جاننے والا اس عالم میں سوائے میرے کوئی نہیں کہ جبرائیل نے یہ کمال روحی کیونکر حاصل کیا۔ سنو! مسیحؐ کی ولادت کا اسی زمرے سے تعلق ہے۔ یہ جبرائیل تھے جو مریم

صِدْقَةٰ کے جسم میں حلول کر کے مسیح کی صورت میں متغیر ہوئے اور تحوڑے زمانے میں اپنا روحی کمال حاصل کر کے چلے گئے۔ مسیحیوں کو دھوکا ہوا کہ خدا تھا۔ مگر نہیں، صرف ایک روح تھی جو ایک جسم سے جس میں دوسری روح بھی موجود تھی، کمالاتِ جسمانی حاصل کر کے آسمان پر چلی گئی۔ مسیح کی روح ایک دوسری روح تھی جو ان کے جسم میں تھی، مگر اسی کے ساتھ جبرایل کی بھی ان کے پیکر میں اُتر کے چند روز ہی میں مسیح کے جسم میں الوہیت کی شان نمودار کر کے غائب ہو گئی۔ مُردوں کا زندہ کر دینا یہ مسیح کا کام نہ تھا بلکہ صرف جبرایل کی ملکوتی قوت کا مشہور اور مسلم نتیجہ جس کا لوگوں کو موسٹی کے لیے مشاہدہ ہو چکا تھا۔ مگر جن کو خدا نے چشمِ پینا نہیں دی، آج بھی نہیں سمجھ سکتے اور مسیح کے اس معجزے کو یاد کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ الغرض یہی متغیر و متشکل ہو سکنے کا کمال ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے ہر روح دنیا میں آئی ہے۔ اور یہاں سے جانے کے بعد اسی کمال کے مطابق جنتِ دوزخ میں اپنے کردار کا جزا و ثواب پاتی ہے۔ تم میرے کمالات سے ناواقف ہو۔ میں وہ شخص ہوں کہ خود ہی نہیں، ہر شخص کو اُس مالاِ عالیٰ پر پہنچا کے وہاں کی ہر چیز دکھا سکتا ہوں اور میرے اختیار میں ہے کہ جنت کے روحانی پیکروں کو اس جہنمِ خاکی کے سامنے لا کھڑا.....

شیخ نے یہیں تک کہا تھا کہ حسین روتا اور التجا کرتا ہوا اُن کے قدموں پر گرا اور کہا ”یا حضرت! مجھے مسئلے میں شک نہیں۔ مگر اتنی تمنا ہے کہ اس سروشبستان اور جنت میں ہو آؤ۔ وقت ہو گیا کہ اپنی التجا آپ کے سامنے پیش کروں اور یقین ہے کہ محروم نہ رہوں گا۔“

حسین دیر تک شیخ کے قدموں پر پڑا روتا رہا مگر شیخ اس قدر جوش میں بھرے ہوئے تھے کہ چند ساعت تک خاموش کھڑے رہے، پھر اس کو اٹھا کے بٹھایا اور کہا ”حسین! میرے اس وقت کے جوش سے تو نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خیر، اب اس وقت تو تامن کر۔ کل تہائی میں پھر درخواست کرنا۔

بے شک وقت آگیا ہے کہ تجھے اس محنت و ریاضت کا پھل ملے۔ مگر ابھی تیرا متحان باقی ہے اور سخت امتحان۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تو نے کہاں تک اپنے آپ کو مرشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اور یاد رکھ کہ جس قدر تجھے مرشد کا حکم بجالانے میں تامّل ہو گا، اسی قدر اپنا مقصد حاصل کرنے میں دیر ہو گی۔

سب مرید رخصت ہو کے چلے گئے۔ حسین بھی اس بچھونے پر لیٹا۔ مگر یہ رات اس نے نہایت ہی انتظار و اضطراب میں گزاری۔ اس لیے کہ آتش شوق تیز تر گرد کا مضمون تھا۔ صحیح کونماز کے بعد جیسے ہی شیخ علی وجودی نے وظیفے سے فراغت پائی، حسین ان کے قدموں پر گر پڑا اور چلا یا：“اب زیادہ صبر کی تاب نہیں۔ آپ کو سب حالات خود ہی معلوم ہوتے ہیں، مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر خدا کے لیے زمرد سے جلدی ملا یئے۔”

شیخ: بہتر تو زمرد سے ملے گا۔ اس کے وصل سے کامیاب ہو گا۔ مگر اس کے لیے اچھی طرح تیار ہے؟

حسین: دل و جان سے تیار۔

شیخ: دیکھ، تجھے تامّل نہ ہو۔

حسین: ذرا نہیں۔

شیخ: تیرے دل میں شک اور بد عقیدگی نہ پیدا ہو۔

حسین: نہیں، ہرگز نہیں۔

شیخ: وہ جرأت کا کام ہے۔

حسین: میں جان لڑا دوں گا۔

شیخ: اس میں خطرے بھی ہیں۔

حسین: ہوں۔

شیخ: تو سُن!

حسین: ارشاد؟

شیخ: ابھی نہیں۔ دل مضبوط کر لے۔

حسین: خوب مضبوط ہے۔

شیخ: مجھے معلوم ہے کہ تو نے کتب درسیہ امام نجم الدین غیشا پوری سے پڑھی ہیں اور انھی کا تو مرید بھی ہے۔

حسین: (حیرت سے) بے شک، ہوں۔ پورے پانچ سال ان کے حلقوں درس میں شریک رہا۔

شیخ: تیرے دل میں ان کی کتنی وقت ہے؟

حسین: تمام عالم میں آپ کے بعد بس انھی کو بڑا عالم و فاضل، بہت بڑا خدا شناس اور سب سے زیادہ مشقی و پر ہیز گار سمجھتا ہوں۔

شیخ: خیر، تو جا۔ ان کے جلے میں پھر شریک ہوا اور جس وقت موقع ملے، ان کو قتل..... شیخ کی زبان سے صرف اتنا ہی انکا تھا کہ حسین نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

ملا علی کا سفر

امام نجم الدین غیثا پوری اس عہد کے بڑے امام تھے۔ تمام زمانے میں ان کی نیک نفسی اور علم و فضل کی شہرت تھی۔ شاہک درجہ کوئی مقام ہو گا، جہاں ان کے شاگرد مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی مقتداً نہ کر رہے ہوں وہ حسین کے استاد مرشد ہی نہیں بلکہ چچا بھی تھے۔ ان کا اصلی وطن شہر کابل میں تھا۔ چھوٹی ہی عمر میں طلب علم کے شوق میں گھر سے نکل گئے تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی درس گاہوں میں شریک ہو کے بغداد پہنچے۔ ایک مدت دراز تک مدرسہ نظامیہ کی طالب علمی کی۔ پھر مشرقی باد کی سیاست میں مشغول ہوئے۔ بخارا و ہرات کی علمی صحبتوں میں شریک ہوئے اور وہاں کے علماء کی درس گاہوں سے خوش چینی کر کے غیثا پور میں آئے اور وہیں متوطن ہو گئے۔ اب ان دونوں علم و فضل کے بڑے مرکز اور خداشناسی کے نامور قطب بنے ہوئے تھے۔

حسین نے ایک ایسے نیک نفس اور باحداعزیز کے قتل کرنے کا حکم سننا تو یہاں کچھ ایسی حیرت و پریشانی ہوئی کہ بے ہوش ہو گیا۔ شیخ علی وجودی نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر نہ کی بلکہ اسی طرح زمین پر پڑا رہنے دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ انتظار کرتے رہے کہ حسین خود ہی ہوش میں آ کے حکم بجالانے کا وعدہ کرے۔ مگر جب اسے ہوش میں آنے میں دیر ہوئی تو اسی طرح چھوڑ کے ایک دوسرے جھرے میں چلے گئے۔ شاید دو گھنٹے میں حسین کو ہوش آیا اور اس کے ساتھ ہی شیخ کا واجب انتقال حکم بھی یاد آیا۔ قریب تھا کہ دریاۓ غفلت میں پھر ایک غوطہ لگائے، مگر سنجھا اور اٹھ کے چاروں طرف دیکھا۔ شیخ علی وجودی غائب تھے اور تنہا وہی تھا۔

گزشتہ باتوں کو یاد کر کے حیرت کرنے لگا ”کیا مجھے شیخ کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی؟“ بے شک ایسا

ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے نیک نفس اور حقیقت ہیں شیخ نے تو اس قسم کے سخت ظلم و گناہ کا حکم نہ دیا ہو گا۔ مجھے قتلِ عمد کی ہدایت، اور قتل بھی کس کا؟ شیخ نجم الدین غیثا پوری کا جن سے بڑا عالم فاضل اس وقت صفحہء ہستی پر نہیں۔ یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی۔ مگر فرض کر لیا جائے کہ شیخ نے یہی حکم دیا ہے تو بھی یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ اپنے پیر و مرشد اور با خدا پچھا کو قتل کر ڈالوں۔ (کانپ کر) بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟ اور پھر دین میں بھی تو ہے کہ من قتل مُؤْمِنًا مُعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ اس حکم کو بجالا کے سوا اس کے رو سیاہی دارین حاصل کروں اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ حُسْنُ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَة
کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن ہاں، شیخ نے کہا تھا کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ اس میں بھی کوئی فائدہ ضرور متصور ہو گا۔ حقیقت میں وہ رمزِ قدرت جانتے ہیں۔ امام نجم الدین شیخ علی وجودی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ خیال میں آتا ہے کہ شیخ علی وجودی کی نیت بُری ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر کسی روحانی مصلحت سے انھوں نے بظاہر ایسے مکروہ کام کا حکم دیا ہو۔ واقعی اگر یہی حکم ہو تو مجھے تامل نہ کرنا چاہیے۔ یہ میرا پہلا امتحان ہے۔ اگر ذرا بھی عذر کیا تو گناہ گار بھی ہوں گا اور زُمرد کے وصال سے بھی محروم رہوں گا۔ اس تعمیلِ حکم میں دینی فائدہ تو بد یہی ہے۔ کیونکہ شیخ کا امر واجب الاذعان ہے۔ باقی دنیاوی بدنامی تو اس کی ہستی نہیں۔ اگر کسی قدر ہے تو اس کے عوض میں کتنا بڑا فائدہ ہے کہ پیاری زمرد کی ہم کناری اسی زندگی میں نصیب ہو جائے گی۔ ”دل میں یہ خیال جما کے حسین حجرے سے نکلا اور مختلف حجروں میں ڈھونڈتا ہوا اُس حجرے میں جا پہنچا جہاں شیخ علی وجودی تھے۔ اُن کی صورت دیکھتے ہی قدموں پر سر کھدیا اور چلایا۔ ”مجھے وہ حکم یاد نہیں رہا۔ جلدی بتائیے کہ تعمیل کو روانہ ہوں۔“

شیخ: دیکھو! اب کے تامل نہ ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دل میں بدگمانی پیدا ہوا اور تم اپنی

ساری محنت ضائع کر دو۔ خوب یاد رکھو کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔

حسین: خوب یاد ہے، اور مجھے ذرا تامل نہ ہو گا۔

شیخ: تو جاؤ، امام نجم الدین غیثا پوری کو قتل کر دو۔

حسین: (دل مضبوط کر کے) بہتر۔ لیکن اگر میں مارڈا لا گیا؟

شیخ: کوئی مضاائقہ نہیں۔ بلاز جمٹ زمرد سے جا ملوگے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہ ہو گا۔

حسین: تو میں رخصت ہوتا ہوں۔

شیخ: ٹھہرو (ایک تیز خبر نکال کر) اس خبر کو اپنے پاس چھپا کے رکھو۔ جس وقت موقع ملے، اس سے کام لینا۔

مُرشد کا عطا کیا ہوا خبر لے کر حسین نے اپنے استاد کی جان لینے کو شرق کی راہ لی۔ ڈیڑھ مہینے بعد بغداد پہنچا۔ وہاں سے چل کے اصفہان اور اصفہان سے ایک مہینے بعد غیثا پور پہنچ گیا۔ حاب سے نکلے چار مہینے ہوئے تھے کہ امام نجم الدین کی درس گاہ میں حاضر ہو گیا۔ امام موصوف پہچانتے ہی بغل گیر ہوئے اور بے انہتا شفقت سے پیش آئے۔

گھر کے خطوط سے انھیں یہ خبر معلوم ہو چکی تھی کہ حسین ایک شریف لڑکی کو ساتھ لے کے بدنامی کے ساتھ نکل گیا ہے، جس کا تذکرہ کر کے انہوں نے افسوس کیا اور کہا ”حسین، مجھے ایسی امید نہ تھی کہ علم کو اس ذوق و شوق سے حاصل کر کے تم اس کی بُرُّ مرتی کرو گے۔“

حسین: یا عَمَّ! میں کسی بری نیت سے نہیں لے گیا تھا۔ زمرد کا عقد میرے ہی ساتھ ہونے والا تھا

اور وہ حج کی بے انہتا مشتاق تھی۔ اس علم دین کی وجہ سے مجھے ناگوار ہوا کہ اُس کی دینی خواہش کا

خیال نہ کروں۔ بے تامل ساتھ لے کر چل کھڑا ہوا۔

امام: اور اب وہ کہاں ہے؟

حسین: جہاں طالقان کی گھائیاں ہیں۔ پر یوں کے ہاتھ سے مارڈاں گئی۔

امام: (مسکرا کر) ایسا مہمل اور بے سرو پا قصہ بنانے سے کیا حاصل۔ اسے کوئی تسلیم ہی نہیں کرے گا۔

حسین: جس بے تکلفی سے میں نے یہ قصہ بیان کر دیا ہے، اسی سے آپ اندازہ فرماسکتے ہیں کہ میرے بیان میں کسی بناوٹ کا داخل نہیں۔

امام: خیر، اب یہاں کس غرض سے آئے ہو؟

حسین: آپ کے حلقة درس میں شامل ہونے کے لیے۔ زمرد کے غم میں میں نے ارادہ کر لیا ہے

کہ علاقے دنیوی کو چھوڑ دوں اور چاہتا ہوں کہ باقی ماندہ زندگی تحریک علم ہی میں صرف ہو جائے۔

امام: اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے ارادے میں برکت دے اور تمھیں تو فیق ہو کہ میرے بعد اس درس گاہ کے مالک بنو۔

الغرض حسین، امام نجم الدین کے خوشہ چینوں میں شامل ہو گیا۔ اور چونکہ بھتیجا تھا، ان کے دل میں روز بروز اپنا زیادہ اعتبار پیدا کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنا موقع بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ امام کثرت اوقات طلباء اور معتقدین کے مجمع میں رہتے جس کی وجہ سے تین مہینے گزر گئے اور حسین کو تحریک کرنے کا موقع نہ ملا۔ چوتھے مہینے میں کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اتفاقاً امام کوششہت سے بخار آیا اور کئی دن تک درس و تدریس کا سلسلہ موقوف رہا۔ اس بیکاری کے زمانے میں اکثر طلباء تو ادھر ادھر پھرتے

رہے مگر حسین نے امام کی تیمارداری میں انہا سے زیادہ گرم جوشی اور سعادت مندی دکھائی۔ شب و روزان کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں مصروف رہا۔

امام کو بخار آئے چھٹا دن تھا کہ ایک رات کو اتفاقاً ان کے جھرے میں اکیلا حسین ہی تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اور امام بچھونے پر لیٹے ناتوانی کی آواز میں اس سے با تیس کر رہے تھے۔ حسین خلافِ معمول آج خاموش تھا۔ ان کی باتوں پر ہونکاری تو ضرور کرتا جاتا تھا مگر اس کے سوا کوئی اور لفظ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ کئی مرتبہ امام کو تعجب ہوا بلکہ کئی مرتبہ پوچھنے لگے کہ آج تم خاموش کیوں ہو؟ مگر حسین نے ”یوں ہی“ کہہ کے ٹال دیا۔ اور باہر نکل کرتا رہا۔ اس کی بات کوئی نہ آئے گا۔ اس بات کا یقین کر کے اس نے جھرے کا دروازہ خوب مضبوطی سے بند کر لیا اور پاس جا کے دیکھا اور امام کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ دیر تک کھڑا ان کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور ساعت بہ ساعت اپنے استاد اور بزرگ پر کاری وار کرنے کے لیے زیادہ تیار ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے خون ریز کاموں سے وہ بھی آشنا نہ تھا۔ دل کو زور دے دے کے ابھارتا تھا مگر خیالات ایسا پلٹا کھاتے تھے کہ بار بار ہمت ہار دیتا۔ جھرے میں ہر طرف سے ایسی ایسی خیالی با تیں نظر آتیں اور ان کا ایسا رعب پڑتا تھا کہ معلوم ہوتا کہ جیسے فرشتہ یا کسی اور چیز کی غیر جسمانی مخلوق امام کی حفاظت کر رہی ہے۔ خود امام کا چہرہ اُس کے خیال کی آنکھوں میں نہایت ہی نورانی بن کے سفارش کرتا اور کبھی بھیا نک اور مہیب نظر آ کے ڈر دیتا۔ مگر ان سب خیالات کو اُس نے مٹایا، شیخ وجودی کا عطا کیا ہوا خخبر نکال کے اس کی باڑھ دیکھی اور یکا یک دل مضبوط کر کے امام کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ امام نے چونک کر آنکھ کھولی تھی اور چلانا نہ ہی کو تھے کہ اس کا بایاں ہاتھ ان کے منہ پر اور خخبر ان

کے دل میں تھا۔

چند ہی لمحوں میں امام کی روح پرواز کر گئی۔ خون تمام جھرے میں پھیلا ہوا تھا۔ بے جان لاش خون آلو دکپڑوں میں لپٹی ہوئی بستر پر پڑی تھی۔ اور گویا زور آوری کا کام نہ تھا۔ مگر حسین کے دل کو اتنی بڑی شدید حرکت ہوتی تھی کہ کھڑا کانپ رہا تھا اور بار بار اپنے ہاتھ کے معصوم شہید کی مظلومانہ لاش کو ڈرڈر کے دیکھتا۔ آخر اس نے ان سب چیزوں کو اسی حال میں چھوڑا، جھرے کے خوفناک منظر سے سہی ہوئی آنکھوں سے آخری نظر ڈالی اور دروازہ کھول کے نکلا۔ جھرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور چپکے قدم اٹھاتا ہوا چلا۔ شاید زیادہ وقت نہ ہوا ہو گا کہ شہر کی خانقاہ سے دور نکل گیا۔ نیشاپور کے گرد نہایت ہی مضبوط فصیل تھی اور پھاٹک رات کو بند ہو جاتے تھے، جس کے سبب سے اس وقت اسے باہر نکلنے میں بہت دشواری نظر آئی مگر جان پر کھیل کر ایک تیرہ و تار بد روح کے ذریعے سے باہر نکلا اور نکتے ہی نہایت تیزی سے بھاگتا کہ صحیح ہونے سے پہلے ہی دور نکل جائے کہ کوئی اُسے پانہ سکے۔

دوسرے دن جب وہ شوق کے پیروں سے اڑتا ہوا خراسان کے مغربی میدان اور جنگل قطع کرتا ہوا چلا جاتا تھا، اُس وقت اس کے حواسِ ذراٹھ کانے ہوئے اور ظلم و گناہ یاد آیا جو ہر پہلو سے بُرا تھا۔ اس خیال کے دور کرنے کی برادر کوشش کرتا تھا مگر بار بار زبان سے ایک آہ کے ساتھ جملہ نکل ہی جاتا تھا کہ میں بڑا گنہگار ہوں اور اس کا دل اور اس کا ایمان اس پر لعنت کرتا تھا۔ لعنت اور پھٹکار کی آواز کان میں آتی تھی اور چونک چونک کر کہتا کہ اس فعل کے ذمے دار شیخ علی وجودی ہیں۔ مگر خود ہی دل میں قائل ہو جاتا کہ امام کا کام تو میرے ہاتھ اور میری سنگدلی نے تمام کیا ہے۔ ذمہ داری کسی اور کے سر کیونکر جاسکتی ہے۔ اب کے دل نے شیخ کے اصول میں بھی شک پیدا

کیا کہ مرشد کے ہاتھ میں صرف ایک بے جان اور غیر ذمے دار آئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہنے لگا ”نہیں۔ علمائے روحانیں کا یہ مسئلہ اگر صحیح ہے کہ ثواب اور عذاب اسی لذت والم کا نام ہے جو اپنے کردار کے نتائج میں خود اپنے ضمیر اور دل کی تحسین و خلمت سے پیدا ہوتے ہیں تو انسان کے فعل کا دوسرا ذمے دار نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ میں نے ایک کام کیا۔ اور گوہ کسی مشیر و صلاح کا رکھ کے خیال میں اچھا ہو گریہرے نزدیک بُرا اور قابلِ ملامت ہے، تو اس کے ارتکاب پر میرا دل مجھ پر ضرور لعنت کرے گا اور جب اسی لعنت کے عالم کو اصلاح شرح میں عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے تو بے شک میں دوزخ اور عذاب سے نہ فوج سکوں گا۔

الغرض حسین کے دل نے اُسے قائل کر لیا۔ اب وہ پچھتا رہا ہے اور سخت روحانی تکلیف میں بتلا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شیخ علی وجودی کی وقعت بھی ویسی ہی دل میں موجود ہے۔ شیخ علی وجودی کی وہ ایسی ایسی کرامتیں دیکھے چکا ہے کہ ان پر بدگمانی نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض اوقات ڈر جاتا ہے کہ شیخ غیب کے دلوں کے حالات سے واقف ہیں۔ میرے یہ شکوک کہیں ان کو معلوم ہو گئے تو غضب ہو جائے گا۔ ادھر سے بھی جاؤں گا ادھر سے بھی۔ اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب کے بعد زمرد کے وصال سے محروم رہا تو حسرت ہی رہ جائے گی۔

حسین اسی قسم کے خیالات دل میں لیے نداamt کے دریا میں غرق اپنے فعل پر پچھتا تا ہوا شہر حلب میں داخل ہوا اور شیخ کے سامنے جاتے ہی قدموں پر گرنے کو ہی تھا کہ انہوں نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور نہایت ہی جوش سے کہا ”حسین! تو اچھا امتحان میں پورا اُتر۔ اب زمر دتجھ سے زیادہ تیری مشتاق ہے۔ اُس نور الانوار کے انوارِ ازالی نے تیرے دل پر پورا انکاس کیا اور تیرے جسم کی اس مشت خاک نے یہ صلاحیت پیدا کر لی ہے کہ اُس عالم نور اور سر و شہستان کی تجلیات کی متحمل ہو

سکے۔

حسین: مگر یا حضرت! میرے دل میں اس ظالمانہ فعل کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

شیخ: (جو شیخ میں آ کے) بے شک پیدا ہوتے ہوں گے۔ روح اس مادے کی کثافت سے بڑی بڑی دشواریوں سے علاحدہ ہو سکتی ہے اور صرف یہی چیز ہے جو ان شکوک اور شبہات کو پیدا کرتی ہے۔ وہ مرکزِ اشرافی جو باوجودِ لاتی ہونے کے حیاتِ سرمدی کا چشمہ ہے، اس جسمانی روح پر جو قفسِ عنصری میں مقید ہے، اپنے تنوعاتِ عشق آشکار کر سکتا ہے۔

حسین: مگر اطمینان بخش نصائح ارشاد ہوں کہ دل سے شبہات نکل جائیں۔

شیخ: سُن اے حسین: استقلالِ تیرے شکوک کو دور کر دے گا بشرطیکہ تو ان سے رفع کرنے کی کوشش کرنے میں مشغول رہے۔ مگر تیرے اطمینان کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں تکمیلِ نفس اسی کا نام ہے اور یہی نشاۃالہیات کا ہے کہ روح کے تعلقاتِ جسم سے علیحدہ کیے جائیں۔ جسمانی افعال پر تصرُّف کرتے کرتے روح عادی ہو جاتی ہے کہ بلا استعانتِ مادہ کوئی کام نہ کر سکے اور وہ رو حسین جو جسم کو چھوڑتے وقت انھی مادیات میں پھنس کر رہ گئیں، وہ بعد میں بھی ہر وقت خود کو مادے کے تیرہ و تار قفس میں پاتی ہیں۔ اور یہی چیز اصطلاحِ شرع میں ان کا دوزخ ہے۔ نجات کی کوشش یوں ہونی چاہیے کہ زندگی ہی میں روحی علاقے جسم سے کم کر دیے جائیں۔ اس کوشش کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ جسم سے ایسے کام لیے جائیں جن سے روح کا تعلق نہ ہو۔ پیتا ب ہو کے ان کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اور انسان بہادری و مضبوطی سے اسے جبرا رو کے۔ یہی الہیات کی آئین ہے۔ دوسری یعنی قسمِ وسطیٰ یہ ہے کہ روح ایسے کام کرے جن سے جسم کا تعلق نہ ہو۔ جو لوگ دور

دراز شہروں میں اپنی روح سے اثر ڈال دیا کرتے ہیں، ان کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عالم روحانیات کے اس درمیانی فاصلے کو طے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ قفس جسم سے اپنی علاحدگی حاصل کرے کہ اس نور ال انوار کے انکشافات کی جستجو میں مادے سے مُبْرَأ و مُفْزَر ہو کے ملکوت اور عالمِ لا ہوت کی سیر کرے۔ اس اعلیٰ جستجو کے زمانے میں جو کوئی مر جاتا ہے وہ جسم خاکی کو الوداع کرتے ہی اس نقطہٴ اولیٰ واجبُ العدل سے جاملتا ہے۔ اس وقت اسے وہ اعلیٰ کمال رُوحانی حاصل ہوتا ہے کہ جس کی تحریک کے لیے اُس نے عالمِ مادی کی یہ قید اٹھا دی تھی اور خجستان کے مصائب میں مُبْتَلًا ہوا تھا۔ اب اس کی یہ حالت ہوئی ہے کہ ایک طرف تو تعلقاتِ جسمی کی مادی تعلیمات سے اس سے یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جب چاہے اس عالم کے سامنے اپنے آپ کو تخلیٰ و متشکل کر دکھائے اور دوسری طرف اس میں کمالِ روحانیت و تجزیہ اس درجے کا ہوتا ہے کہ جب چاہے اس نقطہٴ ازالہ اور اولیٰ مرکز نور ال انوار سے جا ملے۔ لہذا اے حسین! تو اس مدرسہِ روحانیت کی ابتدائی جماعت میں ہے اور ابھی اس امر کی مشق کر رہا ہے کہ تیرے ارکان و جوارح سے ایسے افعال و حرکات صادر ہوں جن کی طرف تو منسوب کرے، یہ لعنت ملامت جو تیرا نفس اور تیری روح تجھ پر کر رہی ہے۔ یہ اسی تعلقِ روحی کا نام ہے جس سے قطع کرنے کی کوشش تجھے کرنی چاہیے۔ اور جب تو یہ کمال حاصل کر لے گا کہ روح کو تیرے اعضاء کے کسی فعل کی طرف توجہ ہی نہ ہو، اس وقت دوسرے درجہٴ تو حید میں قدم رکھے گا۔

حسین: تو میں ان اذاموں اور ملامتوں کی پرواہ کروں جو خود میرے دل سے مجھ پر پڑ رہی ہے؟

شیخ: ہرگز نہیں۔ اسی امر کی تجھے مشق کرنا ہے اور نور ال انوار کی طرف توجہ کرنی ہی پہلا زینہ ہے۔

حسین: حضرت! آپ اُس خداوندِ جل و علّا کو نور ال انوار کیوں فرماتے ہیں؟ اس کی رمز میں

نہیں سمجھ سکا۔ وہ حضرت رَبُّ الْعِزَّة بے شک نور ہے مگر الانوار کیوں؟

شیخ: (برہم ہو کے) وہ نقطہ وحدت اور سرچشمہ تکوین اس سے بالکل منزہ ہے کہ ہم اپنے ماذی خیال کے صفات کو اس کی جانب منسوب کریں۔ اور وہ ایسا ہے کہ لیس کمثلاً شئی۔

حسین: مگر خود اللہ جل شانہ، نے ان صفات کو اپنی طرف منسوب کر لیا تو ہمیں کیا تأمل ہے؟
شیخ وجودی کی برہمی کی اب انتہانہ تھی۔ انہوں نے حسین کو غصب آلو دا اور سُرخ آنکھوں سے گھور کے دیکھا اور بولے:

”بے شک انسان ظُلُوم و چہوں ہے۔ یہ تیرے خیال میں نہیں آتا کہ ہم محض اُسی کے ارشاد کے بموجب ان صفات کو اس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہم اُسے نور کہتے ہیں، مگر چونکہ ہمارے خیال کے نور سے وہ متزہ ہے الہذا اسے الانوار بھی کہہ دیتے ہیں۔“

حسین: بے شک صحیح ہے۔ اب میراطمینان ہو گیا۔ اور انشاء اللہ بھی اپنے انعام پر نہ پچھتا ہو گا۔ لیکن امیدوار ہوں کہ اب مجھے وہ سرو شہستان دکھایا جائے جہاں میری زمر دا جرامِ فلکی کے پہلو میں بیٹھی جلوہ افغانی کر رہی ہے۔

شیخ: بہتر۔

یہ کہہ کہ شیخ نے اٹھ کے اپنی کتابوں کا صندوق کھولا۔ اُس میں سے ایک چھوٹی کتاب نکالی۔ پھر اس کے ورق اُلٹے، ایک خط نکالا اور اُس کو حسین کے ہاتھ میں دے کے کہا ”لے، اس خط کو احتیاط سے رکھا اور اسی وقت روانہ ہو کے شہر اصفہان کی راہ لے۔ یاد رکھ کہ اصفہان کے شمالی پھاٹک کے باہر ایک شکستہ اور قریب لانہدم مسجد ہے۔ اُس میں تو ایک فقیر کو پاؤے گا جو بظاہر بھیک مانگتا ہے مگر باطن میں ایک بڑا خداشناس شخص ہے۔ یہ فقیر ہر وقت اپنے جسم پر دُنبے کی کھال اُڑھے رکھتا

ہے اور انکساراً یہ صدالگا کر راہ گیروں سے مانگتا ہے کہ ”دھنِ سگ بے لقمه دوختہ ہے“۔ کاظم جنوبي اس کا نام ہے۔ یہ خط لے جا کے اس کے ہاتھ میں دے اور میرا سلام کہہ۔ رات کو تجھے وہ ایک غار میں لے جائے گا جہاں تو ایک بڑے امام واقف اسرائیل مردی سے ملے گا۔ اسی وقت تو جنت کے مدارج طے کرنا شروع کر دے گا اور چند ہی روز کی زندگی میں جوز یادہ تر خواب کی سی ہو گی، فردوس بریں کے اعلیٰ منازل میں جا پہنچے گا۔

حسین نے خط لے کے شیخ کے ہاتھ کو بوس دیا۔ پھر رخصت ہونے کے طریقے سے ان کے قدم چوٹے اور اصفہان کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہوا۔ اب اس کا یہ سفر زیادہ اطمینان سے تھا۔ گناہ کی ملامت و ندامت کے اثر کو شیخ علی وجودی کی تقریر نے اس کے دل سے بالکل محور دیا تھا۔ امید اور آرزو کا باعث اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمرداً کے ہم کنار ہوا چاہتی ہے۔ اسی اطمینان اور ان ہی مسرتوں کے ساتھ بغداد ہوتا ہوا اصفہان پہنچا۔ شمالی پھاٹک کے باہر مسجد کے دروازے پر متر دو کھڑا تھا کہ کان میں آواز آئی ”دھنِ سگ بے لقمه دوختہ ہے“، فوراً دوڑ کے مسجد میں گیا اور شیخ کا خط نکال کر کاظم جنوبي کے ہاتھ میں دے دیا جو دنبے کی کھال اوڑھے بیٹھا زور سے صدائیں لگا رہا تھا۔

کاظم جنوبي نے حسین کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھا اور جوش و حشت کے لبھے میں چلا اٹھا۔ ”خذ راز اہل علم حذر“، مگر جب خط کو پڑھا تو فوراً اٹھ کے بغل گیر ہوا اور کہا ”میں نہیں سمجھا تھا کہ شجر معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔ آؤ، بیٹھو۔ کھاپی کے آرام کرو۔ رات ہو تو تم کو شیخ الجب کے پاس لے چلوں۔ انھیں حیائیت الجب اختیار کرنی چاہیے۔“ دن چونکہ مظہر النور ہے لہذا دن بھر وہ اپنے اوپر انوار لا ہوتا۔ اکبر کا انعکاس کرتے ہیں۔ اور رات چونکہ تیرہ و تار اور نمونہ ظلمت ہے لہذا اسی

ظلمت میں وہ مادی پیکروں سے ایک گونہ علاقہ پیدا کرتے ہیں۔

حسین: مگر معلوم نہیں مجھے جیسے گناہ گاریزویہ کا رہے وہ ملنا بھی پسند کریں گے؟
کاظم جنوبی: ضرور ملیں گے۔ شجرِ معرفت کی ایک شاخ تم ہو۔

حسین دن بھر اسی مسجد میں رہا اور شام کے بعد ایک ٹلوٹ رات گزر گئی تو کاظم جنوبی اسے ساتھ لے کے بیرون کو ہستان کی طرف روانہ ہوا۔ بہت سے نشیب و فراز طے کر کے اور کئی گھاٹیوں سے گزر کر کاظم ایک بڑے غار کے دہانے پر پھر گیا اور زور سے چلا یا:

”یا شیخ! ظلمتِ مادی میں ایک جگنوچکا ہے۔“ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنوبی نے پکار کے کہا ”ایک آئینے سے پردہ اٹھا، جو تجلیات انوارِ لاہوتی سے منعکس ہونا چاہیے۔ اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنوبی نے پکار کر کہا ”ایک آخیشجی پیکر کا مقید سر و شبتان جانے کے لیے مُصر ہے۔“ اس تیسری ندادر پر غار کے اندر سے چٹانوں سے گوختی ہوئی اور انہیں میں سنبھالنے کی آواز آئی۔ ”مرحبا! جوان آملی مر حبا! جنت کی ایک حور دو سال سے تیرے فراق میں بے تاب ہے۔ میں نے اپنی سیر لائی تھی میں ایک طرف اس حور کو فردوسِ بریں کے گوشوں میں روئے اور دوسری طرف تجھے راہ طلب میں قدم مارتے دیکھا ہے۔ اب یہیں سے تجھے لذائند سر و شبتانی حاصل ہونے لگیں گے۔ قدرت کے کرشمے دیکھ،“ اس جملے کے ساتھ ہی غار کی تھی میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور کاظم جنوبی نے حسین سے کہا:

”بس آگے میں نہیں چل سکتا۔ مجال نہیں کہ ایک قدم بھی آگے جاؤں۔“
حسین: کیوں؟

کاظم جنوبی: اگر یک سر ہوئے بر تپرم

فروعِ تجھلی بسوَرَدَپَرَم

جاوَا اور یقین جانو تم شجیر معرفت کی ایک شاخ ہو۔

یہ سنتے ہی حسین نے کاظم جنو بی کو اوپر چھوڑا، خود جوش دل کی بے خودی میں اُمید و آرزو کے خواب دیکھتا ہوا غار میں اُتر اٹھوڑی دیر تک تو ادھر ادھر کی چٹانوں سے ٹکریں کھاتا رہا مگر آخر کار انہا تک پہنچ گیا جہاں اُسے وہنی طرف ایک زینہ ملا۔ اس زینے کے ذریعے سے اور زیادہ نیچے گیا تو اپنے وہم و گمان کے خلاف اس خوفناک کوہستان اور درندوں کے مسکن کے نیچے ایک نہایت وسیع، عالی اور بہت بارونق مکان نظر آیا جس میں ہر طرف کافوری شمعیں روشن تھیں اور عود و لوبان سلگ رہا تھا۔ درود یوار پر طلائی رنگ کے نقش و نگار بنائے گئے تھے اور ان بیل بوٹوں میں نگین پتھر اور شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے جن پر شمعوں کا عکس پڑ کے ہر سمت ایک عجیب عالم پیدا کرتا تھا۔ حسین اس تمام سامانِ عیش کو دیکھ کر مبہوت خود رفتہ ہو گیا اور بے صبری کے جوش میں چللا اٹھا ”کیا فردوسِ بر میں یہی ہے؟“ کہیں قریب ہی تسلی آمیز لمحے میں آواز آئی ”مگر سرو شہستان کے بر کرنے کے لیے یہ پہلی منزل ہے، جہاں ٹھہر کے وہ اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ جنت کی مسرتوں کو یک دیکھ کے از خود رفتہ نہ ہو جائیں۔“

”حسین: مگر آپ کون ہیں، اور کہاں ہیں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے شکر گزار ہوں؟“

”میں تیرے قریب ہی ہوں“ ناگہاں ایک آواز آئی۔ منقش پرده جو پہلے دیوار کا دھوکا دے رہا تھا، کھنچ کے نظر سے غائب ہو گیا اور ایک معمر قومی الجھنہ نہایت ہی نورانی صورت کا آدمی نظر آیا جو زر تار مند پر گاؤ تکیے سے لگا ہوا عجیب بے پرواٹی اور بے نیازی کی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کا نورانی چہرہ آئینہ کی طرح صاف تھا اور اس وقت چاروں طرف سے شمعوں و نیز درود یوار کے

شیشوں کی ضور پڑنے سے آفتاب کی مثل چمک رہا تھا۔ سفید لمبی ڈاڑھی آفتاب کی کرنوں کی طرح چمک رہی تھی۔

حسین یہ نورانی صورت دیکھتے ہی پروانے کی طرح دوڑ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا ”فرمایئے، آپ کون ہیں؟ شاید رضوان آپ ہی کا نام ہے؟“

پیر مرد: نہیں۔ ابھی تو اسی تیرہ خاک داں ”عصری کی حدود میں ہے۔ مگر ہاں، تیری آنکھوں پر سے پہلا پردہ اٹھا ہے۔ اہل دنیا مجھے شیخ الجب (غار والا شیخ) کہتے ہیں مگر اہل حقیقت کی اصطلاح میں طورِ معنی کہلاتا ہوں۔

حسین: (حیرت سے) طورِ معنی حقیقت میں وہی نور ہو گا جو موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر نظر آیا تھا۔

طورِ معنی: مگر ٹواؤ سے متبرہ زار حجاجوں کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔

حسین: لِلّهِ وَهُ سب پر دے بھی اٹھادیجیے۔

طورِ معنی: ابھی ان ماذی کثیف آنکھوں میں اس کی قابلیت نہیں۔ مگر صبر کر۔ اسی کا سامان ہو رہا ہے۔ یہ سب پر دے اٹھ جائیں گے۔

یک ایک خوبصورت نو عمر لڑکے نے آ کے ایک ثربت کالبر یز جام طورِ معنی کے ہاتھ میں دے دیا اور طورِ معنی نے اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھا کے کہا ”اس جام کو پی اور ملکوت سے ایک درجہ اور قریب ہو جا۔“ حسین نے وہ جام فوراً پی لیا جس کے ساتھ ہی اس کا دماغ چکر کھانے لگا اور طورِ معنی کے ساتھ لپٹ کے غافل ہو گیا۔ اس غفلت اور خودوار فتنگی کی نیند میں کئی دفعہ اس کی آنکھ گھلی اور ہر مرتبہ اپنے آپ کو نئے مقام میں پاتا تھا۔ کسی سر بزرو شاداب میدانوں میں ہوتا اور کبھی

وحشت ناک اور پُر خطر گھائیوں میں۔ ہر بیداری میں فرشتہ یا انسان، مگر غیر معمولی قسم کے لوگ، اسے سرو شہستان کے اور زیادہ قریب ہونے کا یقین دلاتے اور وہ یقین کر لیتا۔ آخراً یک مرتبہ اس کی آنکھ گھلی تو ایک نئے نوجوان شخص کے پاس تھا۔ یہ شخص حریر سفید کے کپڑے پہنے تھا جس پر سنہرہ کام تھا۔ اس کے سر پر نہایت ہی بیش قیمت تاج تھا اور اس میں اعلیٰ درجے کے جواہرات لگے ہوئے تھے۔ حسین کی آنکھ جیسے ہی اس خوبصورت نوجوان کے سامنے کھلی جو شاہانہ لباس پہنے اور مُرّضع تاج سر پر رکھے ہوئے تھا، وہ نہایت ہی التجاو عاجزی کے لمحے میں کہنے لگا ”امیدوار کو انتظار نے بے صبر کر دیا ہے۔“

شخص: اے جسمِ خاکی! تو مرا حلِ تحریر کو طے کر چکا تھے نہیں خبر کہ تو آسمان کے قریب اور فردوس میں کے دروازے پر ہے۔ اب نہ گھبرا۔ ملائکہ مُقرّبین تیرے انتظار میں ہیں اور حوریں تیرے لیے بناؤ سنگھار کر رہی ہیں۔

حسین: اور آپ کون ہیں؟

شخص: میں وہ برزخ ہوں جو لا ہوت و نا سوت میں واسطہ ہے۔ یہی میرا جسم ہے جو کبھی اور بن کے سینے پر چمکا تھا۔ یہی وہ نور ہے جو مسیح علیہ السلام کے جسم سے خدا کی شان دکھاتا تھا اور مردوں میں زندگی کا چدائی روشن کر دیتا تھا۔ یہی وہ نور ہے جو اشراقِ مجرد کی شان سے رسول آخر ازمان ﷺ کے سینے میں چمکا۔ اور یہی وہ نور ہے جو امامت کے مشعل روشن کر کے معصوم جسدوں کو بدلتا ہے۔

حسین: تو آپ جبرئیل ہیں؟

شخص: جبرئیل میرے تنوعات کی ایک چھوٹی سی شمع ہے۔

حسین: شاید آپ وہی لا یموت ہیں؟

شخص: وہی لا یموت نہیں، تھی لا یموت، مگر اس تشخیص کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ گویا ضرور کہوں گا آنا خالق الارواح، آنا خالق الا صباوح۔ لیکن اس وقت تو ایک پیکر متغیر میں ہوں اور وہ امام بن کر نمودار ہوا ہوں جس پر ایمان لانا ہر مکف کا فرض ہے۔

حسین: (ہاتھ سے ہاتھ ملائے) تو میں بھی آپ کی امامت کے لیے اس مظہر نقطہ وحدت کے ہاتھ پر بیعت کروں؟

شخص: حسین، سُن تو منزلِ مقصود کو پہنچ گیا، مدارج صعود طے ہو گئے اور عنقریب تو اُس پر شوق آغوش میں ہو گا جو دو سال سے تیرے لیے گھلی ہے۔ اگر چاہ کوئی عبادتِ دنیاوی تجھ پر فرض نہیں تاہم ارضی کشافت کا باقی ماندہ اثر دل سے نکال ڈالنے کے لیے ضرور ہے کہ اس سر و شہستان کے پھاٹک پر تین دن تک بیٹھ کے تو ایک مختصر سی عبادت کرے۔ تین شبانہ روز تیری زبان سے نکلتا رہے کہ مر گو اثوار اغتر قُنْتَنِ فی بحرِ انوارِ ک۔ مگر شرط یہ ہے کہ چاہے کچھ کھالے مگر ان تین دن میں پانی کا کوئی قطرہ تیرے حق سے نہ اُترے۔

اتنا کہہ کر یہ تا جدار شخص تین روٹیاں چھوڑ کے چلا گیا اور اُس کے جاتے ہی مکان کے سب دروازے بیکا یک اور ایک ساتھ بند ہو گئے۔ پہلے تو یا پی تہائی کی حالت دیکھ کر گھبرا یا ملفو رہ اُس آخری مرشد و امام کی نصیحت یاد آئی اور ریاضت اور وظیفہ میں مشغول ہو گیا۔ علی الٰ تعالیٰ ایک ہی جملہ کہتے رہنے اور پھر پانی نہ پینے کا یہ نتیجہ تھا کہ تیرے روز پیاس نے مجذون بنادیا تھا۔ ہوتوں سے لے کے سینے تک سارا گلا خشک تھا اور سوائے سائیں سائیں کے اور کوئی آوازنہ نکلتی تھی۔ مگر زمرد کے شوق میں وظیفے سے زبان بند نہ ہوئی اور اسی استقلال اور خود فراموشی سے دعا پڑھتا جاتا

تھا۔

تیرے روز حسین زبانِ حال سے اعطش پکار رہا تھا کہ وہ تاجدار نوجوان شاہانہ لباس پہنے ہوئے آیا اور کہا ”لے اب سفر جنت کے لیے تیار ہو۔ تیری ریاضت پوری ہوئی۔ تو نے سب مراحل یقینی طے کر لیے اور کوئی چیز باقی نہ رہی جو اس راہ میں تیری مزاحم ہو۔ مگر تو پیاسا ہے۔ زرا اپنے آپ کوتازہ دم کر لے۔“

اس شخص کی زبان سے یہ جملہ پوری طرح نکلنے پایا تھا کہ ایک حسین و ناز نیں عورت ایک سونے کا مرصع جام ہاتھ میں لیے، جو ایک خاص قسم کے لطیف و خوش رنگ شربت سے لبا لب تھا، حاضر ہوئی۔ اس شخص نے جام کو حسینہ کے ہاتھ سے لے کے حسین کی طرف بڑھایا اور کہا:

”لے، یہ شراب طہور ہے جس کے دُور فردوسِ بریں میں ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ اس کے پینے سے تیری پیاس، ماندگی، تھکن اور جملہ بد مزگیاں جاتی رہیں گی اور تو ایک نہایت ہی نورانی اور روحانی سُرور کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا۔“

حسین نے فوراً جام لے کے منہ سے لگالیا، اور پیاس کی ایسی شدت تھی کہ وہ دو ہی گھونٹ میں اُتار گیا۔ ایک لحظہ گزرنا ہو گا کہ اُسے سر میں گرانی سی محسوس ہونے لگی جس کے ساتھ ہی خمار آلو د آنکھیں جھپک جھپک کے بند ہو گئیں۔ وہ بے ہوش تھا، اور بے ہوشی بھی ایسی کہ سروپا کی خبر نہ تھی۔

فردوسِ بریں

حسین کو خبر نہیں کر یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی۔ لیکن مد ہوشی تھوڑی کم ہوئی تھی اور نشہ اُترنا شروع ہوا تھا کہ ایک نہایت ہی دل کش اور وجد آور نغمے کی آواز کان میں آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا دل فریب و دل رُبا پری پیکروں کا ایک طائفہ عجیب و غریب اور انہٹا سے زیادہ پُر لطف با جوں اور مزمیر کے ساتھ اپنے نور کے گلوں سے ولولہ خیز بہار کی مسّرت انگیز دھن میں یہ ترانہ مبارکبادا گا رہا ہے کہ ”سلام علیکم طبقتم فا دخلو! ہا خالدین۔“ ایک جوشِ مسّرت کی بے اختیاری سے اُس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف ایسا سماں نظر آیا کہ جدھن نظر جاتی ہے:

کرشمہ دامنِ دل می گشد کہ جا ایں جاست

حسین نے اُس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلاکار اور مُرّضع کشتی میں سوار ہے اور نازک بدن اور پری جمال لڑکوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دلکش نہر کے کنارے ابھی ابھی آ کے ٹھہری ہے۔ نرم اور نظر فریب سبزے کو شفاف اور پاک و صاف پانی اپنی روائی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بعض مقامات پر گنجان اور سایہ دار درخت ہیں جو پیچیدہ اور خدار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر نم آسودہ پیشانی پر دونوں طرف جھکے پڑتے ہیں۔ مگر جہاں پر کشتی کنارے لگی ہے، وہاں ایک کشاورہ مرغزار ہے۔ ان خوبصورت ملّا ہوں کے کہنے کے بموجب وہ کشتی سے اُتر کے سبزہ روئیدہ کی سیر کرنے لگا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سبزے کا ایک پتلہ اور برادر حاشیہ چھوڑ کے شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسہ شروع ہو گیا۔ جونہر کے دونوں طرف چند نظر تک پھیلتا چاگیا ہے۔ اگرچہ پھولوں میں شادابی و خوش رنگی کی وہی شان ہے جو خود رو

پھولوں میں نظر آتی ہے مگر اس قدر تی اجتہاد کے ساتھ خوش رنگی، لیاقت بلکہ بظاہر فوق العادت ہو شیاری و دانائی سے چمن بندی کی گئی ہے۔ چمنوں کی بعض قطاریں تو ایسی ہیں جن میں ایک ہی قسم کے اور ایک ہی رنگ کے پھول ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فوج مختلف کمپوں پر تقسیم ہوتی چلی گئی ہے۔ مگر اکثر چمن ہیں جن میں مختلف رنگ کے پھولوں کو ترکیب دے کر زمین پر ایسی گل کاریاں کی گئی ہیں کہ عقلِ انسانی حیرت میں آ جاتی ہے۔ سارا مرغزار اور ساری وادی جو کوسوں دور تک پھیلی ہوئی ہے اور جیسے ہو بصورت متوازی اور سر بزر و شاداب پہاڑوں نے اپنے حلقے میں لے لیا ہے، ان چمنوں اور پھولوں سے بھری ہے اور مختلف نہریں جو پانی کی چادریں بن بن کے پہاڑوں سے اُرتی ہیں، ان ہی چمنوں اور پھولوں کو درمیان جا بجا بہہ رہی ہیں اور ان کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوبی سے مٹا شہر ہو کے کسی اور وجہ سے گلاب اور کیوڑے کی شان پیدا کر لی ہے۔

یہ نہریں زبانِ حال سے پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسلیم و سلبیل ہیں۔ راستوں اور روشنوں کی ترتیب میں معجزہ نما کیفیت پیدا ہوئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر ڈھوتی ہے تو اس کے دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوشنما سڑک اپنی آنکھ میں لیتی ہے۔ یہ سڑک چمن سے بھی زیادہ کمالِ صنائی دلکھار ہی ہے۔ مختلف قسم اور مختلف رنگ کے سنگ ریزے بچھا کے کوئی سڑک فیروزے کی کوئی یاقوت کی اور کوئی نیلم کی بنادی گئی ہے۔ پھر ترتیب میں یہ لطف ہے کہ جس رنگ کے پھولوں کا چمن ہے، اُسی کی مناسب و موزوں رنگ کی نیلی خوش نما سڑک اُس کے پہلو سے گزری ہے۔ نغمہ سنج طیوران چمنوں میں اڑتے پھرتے ہیں، پھولوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کے عشق و محبت کی داستان سُنا تے ہیں اور خدا جانے کس کمالِ استادی سے تعلیم دی گئی ہے کہ اکثر جانے والے جہاں

دیگر اطراف میں پری پیکروں کے نورانی گلوں سے خیر مقدم کا ترانہ سُنھتے ہیں، وہاں ان نغمہ سُخ طاروں کا ساز بھی اپنے قدرتی ارغنوں سے یہی کلمہ خیر مقدم سُنا تا ہے کہ ”سلام عَلَيْكُمْ طَبِّقُمْ فَادْعُلُوا إِلَيْهَا خَالِدِيْنِ۔“

حسین نے نہایت حیرت و جوش سے دیکھا کہ ان چمنوں میں جا بجا نہروں کے کنارے سونے چاندی کے تخت بجھے ہیں جن پر ریشمی پھولدار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پُر تکلف گاؤں تکیوں سے پیٹھ لگائے دلفریب اور ہوش ربا کم سن لڑکوں کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خوبصورت آفٹ روز گار لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور کہیں نہایت ہی نزاکت اور دلفریب حرکتوں سے ساقی گری کرتے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور گزک کے لیے سدھائے یاقدرت کے سکھائے ہوئے طیور پھولدار درختوں سے پھل توڑ توڑ کے لاتے ہیں اور ان کے سامنے رکھ کے اڑ جاتے ہیں۔ پھل ہی نہیں، یہ خوشنما طیور کپڑوں میں لپٹے ہوئے کبابوں کی پوٹلیاں بھی لاتے ہیں اور ان کے لیے میکشی اور شاہد پرستی کا پورا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ حسین چیز جس نے حسین کو متوجہ کیا وہ یہ تھی کہ سب لوگ بے غل و غش نہایت بے فکری اور اطمینان سے ان لذتوں کے مزے لوٹ رہے تھے اور خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ پاس سے کون گذرتا ہے اور انہیں کس نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ کسی کو کسی سے حسد تھا اور نہ کسی کو کسی لطف کے چھپانے کی ضرورت تھی:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

کے رابا کے کارے نباشد

یہ عالم دیکھ کے حسین کے دل میں ایک جوش و لولہ پیدا ہوا۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا ”

بے شک فردوسِ بریں یہی ہے! یہیں آ کے نیکوکاروں اور ایمان داروں کو اپنے اعمالِ نیک کا صلہ ملتا ہے۔ مگر افسوس! اے زمرد! تو کہاں؟، یہ جملہ نا تمام ہی تھا کہ پاس کے چمن کے پھولوں کے نیچے سے ایک شیریں ودل کش آواز سے کسی نے کہا، تو بھی جنت کے چمنوں ہی کو دیکھ رہا ہے۔ ذرا محلوں اور قصروں کو بھی نظر اٹھا کے دیکھ۔،

اُس نے یہ آواز سنی ہی تھی کہ سامنے سے ایک نہایت ہی نازک اندام اور قیامت خیز نازنین نے گلے میں باہیں ڈال دیں اور مسکرا کے کہا ”میں بھی تیرے لیے ہوں۔“ حسین ذرا جھک کر اس سے علیحدہ ہوا غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا، ”مگر میں پیاری زمرد کے سوا کسی کو نہیں چاہتا۔“ نازنین: وہ بھی مل جائے گی۔ آپ کی خوشی کا پیانہ تنگ ہے۔ ذرا ان سروری مسروتوں سے نگاہ اور دل آشنا ہو لیں تو ان سے ملیے گا۔ دیکھیے جو سامنے موتی کا قصر ہے، وہ آپ ہی کے لیے ہے اور زمرد اسی میں ہے۔“

حسین نے نظر اٹھا کے اس رفیع الشان قصر کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر دیگر عمارتوں پر بھی جا پڑی۔ اُسے نظر آیا کہ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ مسّرت انگلیز ہیں۔ بعض بالکل سونے کی، بعض موغلے کی اور بعض موتیوں کی نظر آتی ہیں۔ تمام مکانات جو حسبِ حیثیت محل، قصر اور کوشک کے لفظ سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں، مذکورہ اشیا کے علاوہ ان ہی میں کوئی فیروزے کا کوئی زمرد کا کوئی یاقوت کا اور کوئی ہیرے کا ہے۔ موتی کے محل جن میں سے ایک حسین کے لیے ہے، ایسے آب دار رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ نیچے سے اوپر تک ایک ہی موتی میں ترشے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جا بجا صدقِ صادق کے جھلکتے ہوئے ٹکڑے جڑے ہیں۔ تمام محلوں پر علاوہ اس رنگ کے جس طرف وہ محل منسوب ہیں۔ ہر درود یا وار کے گرد بلور اور شیشے کے ٹکڑوں

کا حاشیہ بنا ہوا ہے اور ان شیشوں کے نیچے ڈاک دی ہوئی ہے۔ یہ آئینے دن کو آفتاب کی اور رات کو ہزارہا کافوری شمعوں کی روشنی میں اس قدر جگہا اٹھتے ہیں کہ تیز سے تیز نگاہ پہنچانے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ان دیواروں میں اندر باہر جواہرات جڑے ہیں جو اپنی کرنیں چمکا چمکا کے ایک عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ بہر تقدیر اس مجموعی سامان، سنهری روپہلے اور رنگ برنگ کے قصر و ان کے آئینوں اور جواہرات نے ہر چہار طرف ایک ایسی کیفیت بنا رکھی ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان کے دل میں ایک جوش اور ولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسین ان محلوں کو دیکھ کر ذرا مبہوت کھڑا رہا مگر ہوش کے آتے ہی اس خاص محل کی طرف متوجہ ہو جس کی نسبت اس پری پیکر کی زبان سے سنا تھا کہ خاص اس کے لیے ہے اور جس میں پیاری زمرد کے ملنے کی امید تھی۔ اس نے کسی چیز کی طرف نظر اٹھائی نہ کسی سامانِ عشرت کو دیکھا اور سیدھا اس قصر کے دروازے پر جا پہنچا۔ زمرد استقبال کے محل سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ ایک غیر معمولی مگر نہایت دربار وضع سے بال کھولے اور زلفوں کو شانوں اور پیٹھ پر بکھیرے کھڑی تھی۔ آنکھیں دو چار ہوئی تھیں کہ بے اختیاری کے جوش میں دونوں کی زبانوں سے ایک دوسرے کا نام نکلا اور وہ دوڑ کے لپٹ گئے۔ حسین تو حسرت میں تھا ہی، زمرد کے چہرے سے بھی ایک غیر معمولی مسّرت و جوش دیکھ کر بے اختیار ہو کے رونے لگا۔ اس کی سانس سے رونے کا پتا پا کے زمرد نے اپنے آپ کو علیحدہ کیا اور کہا:

”حسین! یہاں رونا حرام ہے۔ پس آنسو پوچھ ڈالو۔“

حسین: (آنسوں کو پوچھ کے) زمرد، یہی فردوسِ بریں ہے؟“

زمرد: یہی۔

حسین: تم یہاں چلی آئیں اور مجھے اس درد والم میں چھوڑ دیا۔

زمرد: یہ تو میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ مجھے تو ایک اتفاقی شہادت نے یہاں پہنچایا ہے۔ مگر تمہاری زندگی باقی تھی، اور ضرور تھا کہ اتنے مدارج و مراحل طے کر کے یہاں آؤ۔ مگر اس جنت میں بھی تم کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کیا کہوں، کس قدر دشواریوں سے مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ تمہیں اپنے پاس آنے کا راستہ اور طریقہ بتاؤ۔

حسین: میرے تو ایسے اعمال تھے کہ شاید مرنے کے بعد بھی یہاں نہ پہنچ سکتا۔ صرف تمہاری محبت تھی جو خضر طریقت بن کے لائی۔

زمرد: میری محبت؟

حسین: ہاں، تمہاری محبت۔

زمرد: لیکن اگر تمہارے دل میں طلب صادق نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتی تھی؟

حسین: مگر اس طالب سے تھوڑا ہی ممکن تھا کہ اس ملائے اعلیٰ میں آپنچتا۔ میں تو دل میں ٹھان چکا تھا کہ اس قبر کے پاس اور اس چٹان کے سامنے جس پر تمہارا نام کندہ ہے، پڑے پڑے دم توڑ دوں گا۔

زمرد: خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی اب اندر چل کے آرام سے بیٹھو۔ شراب ٹھہور کے دو جام پہیو اور دیکھواں خداوند جل و علیٰ نے تمہارے لیے کیسے کیسے سامانِ راحت اور کیسی کیسی لذتیں فرم کر رکھی ہیں۔ (یہ کہہ کر زمرد حسین کو اندر لے گئی۔) جس وقت حسین نہر کے کنارے کشتی سے اُترا ہے، سر شام کا وقت تھا۔ مگر اب رات ہو گئی تھی۔ ہر طرف کافوری شمعیں روشن ہوئیں۔ ایک خاص قسم کی ٹھنڈی روشنی جس کا پتانہ چلتا تھا کہ کہاں سے آتی ہے اور کیونکہ پیدا ہوتی ہے دروازوں اور

بند کھڑکیوں اور چھپت کے روشنداں سے رہ رہ کے چمک اٹھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا یکا کیک
ہزار مہتابیاں چھوڑ دی گئیں۔ اس تیز روشنی میں شمعیں ماند پڑ جاتی تھیں اور سارے ہم صحبوں کا
چہرہ ایک دوسرے کو پیارا اور لفربیب نظر آنے لگتا تھا۔ اس غیبی روشنی کو حسین نے حیرت سے دیکھا
اور دریافت کیا کہ یہ کیسی روشنی ہے؟ وہ بار بار دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا مگر کچھ حال نہ
گھلا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس روشنی کا مرکز منع اردو گرد کی پہاڑیوں کی چوٹی پر ہے جہاں وہ
زیادہ چمکتی ہے اور وہیں سے اس کی کرنیں آکے تمام مکانات کو روشن کر دیتی ہیں۔ ایک یہ بات
اس نے دیکھی کہ جب روشنی پوری اور کمال پر آ جاتی تو چاروں طرف سے لوگ چلا اٹھتے ہیں۔^{حکی}
ہند الٰذی وَعَدَنِی رَبِّی۔ سب کے ساتھ ایک بے اختیاری کے جوش میں یہی کلمہ خود حسین کی زبان
سے بھی کئی مرتبہ نکل گیا۔ جب اس روشنی کا راز حسین کے لیے حل نہ ہو سکا تو اس نے زمرد سے
پوچھا ”یہ کیسی روشنی ہے؟“

زمرد: تم نے نہیں پہچانا؟ یہی وہ نورِ الٰہی ہے جو موی کو وادی ایمن میں نظر آیا تھا۔ تم نے قرآن و
حدیث میں پڑھا ہے کہ جنت میں خدا کا دیدار ہوگا۔ اس سے یہی نور عبارت ہے۔

حسین: تو یہی خداوند جل جل علیٰ ہے؟

زمرد: یہ تو نہیں کہہ سکتی مگر ہاں۔ اس کے تنوع اولیٰ کی سب سے زیادہ مکمل اور سچی تصویر یہی
ہے۔ یہ جواب سن کر حسین اس نور کے سامنے سجدے میں گر پڑا مگر زمرد نے اٹھایا اور کہا ”یہاں
عبادت کی تکلیف نہیں۔ یہ نور صرف اس غرض سے ہے کہ لوگوں کے دل میں اطمینان کی مسّرت
پیدا ہو۔“

اب حسین نے مکان کے فرش اور تمام سامان کو دیکھا، اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب نوری سامان

ہے جو دنیا میں نہ کبھی انسان کے دل میں گزر آبے نہ کسی کے قیاس و گمان میں آ سکتا ہے۔ زمردار
کے ہاتھ میں ہاتھ دیے یہاں کی عجوبہ چیزیں دکھاتی پھرتی تھی اور حسین ہر چیز پر خدا نے ذوالجلال
والاکرام کی قدرت و رحمت کا جوش و خروش سے اعتراف کرتا تھا۔ آخر پھرتے پھرتے ایک مقام پر
رُک گیا اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ زمرد سے لپٹ گیا اور کہا ”یہ سب لطف اور سارے سامان
عیش کے ہیں۔ مگر زمرد! میرے لیے کوئی تجھ سے بڑی نعمت نہیں ہو سکتی۔“

زمرد: یہی محبت تمھیں یہاں لائی ہے، ورنہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی زندہ انسان کا بہت کم گزر
ہوتا ہے۔ یہ تمہاری بڑی فضیلت ہے کہ اس جسمِ خاکی کے ساتھ اس نورستان میں آپنچے۔ حسین کو
جنت میں پھرتے اور زمرد کے حُسن و جمال سے لطف اٹھاتے پورا ایک ہفتہ گزر گیا ہو گا۔ اور یہ
ہفتہ اس حالت میں گزر اکہ دل کش اور نشاط انگیز نغموں کی آواز پُرا شر کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔
بہت سی سوریں اس کی خدمت کو حاضر تھیں اور سب پری جمال و زاہد فریب تھیں۔ مگر اسے زمرد کے
سوکسی سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ ہر وقت زمرد کی بغل میں ہاتھ رہتا اور دونوں ہمیشہ فرحت بخش
وادیوں اور روح افزام رغزاروں میں ٹھلتے رہتے۔ زمرد نے اتنے زمانے میں پھر پھر کے اسے
یہاں کی تمام نزہت گاہیں اور سب عجائب دکھادیے۔ ایک مرتبہ حسین نے کہا ”زمرد! میں سنتا تھا
کہ جنت میں ہمیشہ صبح کا وقت ہوتا ہے مگر آ کے دیکھاتو یہاں بھی دنیا ہی کے سے تغیرات موجود
ہیں۔“

زمرد: اس امر میں لوگوں کو سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں ہر وقت صبح ہی رہتی ہے تو
اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور کسی وقت کا لطف انسان یہاں اٹھا سکتا ہی نہیں۔ ایسا ہو تو جنت سے ایک
بڑا لطف اٹھ جائے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر وقت کوئی ایسا مقام ضرور مل جائے گا جہاں

انسان جس وقت کا چاہے، لطف اٹھائے۔

حسین: کیونکر؟

زمرد: زبان سے کہنے کی نہیں۔ میں چل کے تمھیں آنکھوں سے دکھائے دیتی ہوں۔

یہ کہہ کے زمرد اسے لیے ہوئے محل سے باہر نکلی اور کہا ”دیکھو! یہاں دو پھر کا سماں ہے۔ اب آگے چلو۔“ تھوڑی دری بعد دونوں ایک ایسے درختوں سے گھرے ہوئے سبزہ زار میں پہنچ جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے ہوئے تھے، ہر طرف اندر ہیرا چھایا ہوا تھا اور مشرقی قلعہ ہائے کوہ سے ہلکی روشنی نمودار تھی۔ زمرد یہاں پہنچ کے بولی ”دیکھو: یہ صبح کا وقت ہے۔“

حسین: بے شک، ہے۔

زمرد: آگے چلو۔

یہاں سے روانہ ہو کے تھوڑی دری میں دونوں ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف تاریکی پیدا کر دی تھی اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلاکا ڈھواں اٹھتا نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں طیور کے چچھانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے قللے پر آفتاب کے غروب ہونے کی بھی شعاعیں نظر آ رہی تھیں۔ زمرد نے یہاں رُک کے کہا ”اور یہ شام ہوئی۔“

حسین: اس میں کے شک ہو سکتا ہے۔

زمرد: دن کا سماں دیکھے چکے اور شام بھی دیکھے لی۔ صرف رات کا وقت باقی ہے۔ چلو، وہ بھی دکھائے دیتی ہوں۔ یہاں سے واپس آ کے زمرد حسین کو لیے ہوئے ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوئی جہاں نہایت خوبی سے ایک نشیبی راستہ بنा ہوا تھا۔ زینے نہ تھے بلکہ زمین جو پختہ سطح اور نگ

برنگ کی تھی، ساعت بساعت پنج ہوتی جاتی تھی۔ اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت ہی عالیشان اور پُرلطف جگہ میں پہنچے، جہاں ہر جگہ کافوری شمعیں روشن تھیں، جھاڑا اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے اور درود یوار اور شیشے کے رنگ برنگ ٹکڑوں کو ان شمعوں کی شان خیں کچھایسی عجیب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔

زمرد: دیکھو! یہ رات ہے، اور کیسی پیاری رات!

حسین: پیاری زمرد! اگر تو ساتھ ہو تو ہر چیز پیاری ہے۔

یہ سب سامان دیکھ کے دونوں اپنے قصر میں واپس آئے اور باہم عشق و محبت کی باتیں کرنے لگے۔ مگر پہلے زمرد اب کسی قدر افسرد تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ زبردستی کوشش کر کے چہرے کو شاش بناتی ہے مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ حسین نے اس امر کو حیرت سے دیکھا اور کہا ”زمرد! اس فردوس بریں میں آج تم مجھے ملول نظر آتی ہو؟“

زمرد: نہیں۔ مگر ہاں، گزشتہ مفارقت کسی کسی وقت یاد آ جاتی ہے تو خواہ مخواہ دل بھرا آتا ہے۔

حسین: مگر خدا نے وہ مصیبت کاٹ دی ہے اور اب اُمید ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ یوں ہی ایک دوسرے کے وصل سے حظ اٹھاتے رہیں گے۔

زمرد: خدا کرے ایسا ہو۔ مگر حسین، مجھے اس کی اُمید نہیں۔

حسین: (حیرت سے) اُمید نہیں؟ حیف ہے! یہاں کے لطف تو سرمدی وابدی ہیں۔ یہاں نہ کسی دشمن کا اندیشہ ہو سکتا ہے، نہ کسی حاسد کے حسد کا۔ پھرنا اُمیدی و حرمت نصیبی کا کیا سبب؟ ﴿لَتَفْتَحُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾۔

زمرد: بے شک۔ مگر تم یہاں قبل از وقت آئے ہو اور ابدی و سرمدی لطف اٹھانے کے لیے وہی

لوگ آتے ہیں جو مرنے کے بعد دنیا سے قطع تعلق کر کے آئیں گے۔ تم نے ابھی اس ماڈی دنیا کے علاقے قطع نہیں کیے اور اس ماڈی جسم کو ساتھ لائے ہو جس کو وہ ہیں دنیا میں چھوڑنے کے لیے تمھیں ایک روز اُس عالم میں جانا ضرور ہے۔ دیکھو! حضرت مسیح“ یہاں زندہ آئے اور اب تک ہیں۔ مگر انہیں کبھی کسی لطف میں پورا مزہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ جانتے ہیں کہ یہ قفسِ عصری چھوڑنے کے لیے ایک مرتبہ پھر جانا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کشافتِ ماڈہ اس نورستان میں نہیں۔

حسین: افسوس! پھر کب جاؤں گا؟

زمرد: جب حکم ہو جائے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ وہاں کی شدید ضرورت میں تمھیں بُلارہی ہیں۔

حسین یہُن کے آبدیدہ ہو گیا اور نہایت جوشِ دل سے ایک آہ سرد بھر کر بولا:

رُو گُل سیر نم دیدیم و بہار آخ رشم

مجھے تو ابھی تیرے وصال کا لطف بھی نہیں حاصل ہوا۔ مگر زمرد! مجھ سے تواب نہ جایا جائے گا۔ اس وقت سے میں ہر وقت تیراہاتھا اپنے ہاتھ میں لیے رہوں گا تاکہ کوئی مجھے تجھ سے جدا نہ کرے۔“ یہُن کے زمرد بھی آبدیدہ ہو گئی اور بولی ”حسین! یہ امر تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ جب وقت آئے گا تمھیں خبر بھی نہ ہو گی اور ادنیٰ غنوادگی تمھیں اُس عالم میں پہنچا دے گی۔“

حسین: (روکر) تو پھر تو مجھ سے تمہارے فراق کی مصیبت نہ برداشت کی جائے گی۔ جاتے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں گا، اور تم سے چھوٹے ایک گھڑی بھی نہ گزری ہو گی کہ پھر تمہارے پاس پہنچوں گا۔

زمرد: کہیں ایسا غصب نہ کرنا۔ خود کشی کر لی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی۔ پھر تو قیامت تک

بھی ملنے کی امید نہیں۔

حسین: (زور سے سینے پر ہاتھ دھر کے) ہائے! مجھ سے کیوں کرزندہ رہا جائے گا؟ خدا کے لیے کوئی تدبیر بتاؤ۔ ورنہ سمجھ لو کہ ہمیشہ کے لیے مایوسی ہے۔ اس لیے کے اب دنیا میں جا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہزار روکو، میرا خبر میرے سینے پر اٹھ ہی جائے گا۔ اچھا اگر یہ نہیں تو تم میرے ساتھ چلو۔

زمرد: یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے بس میں ہوں۔ اتنا ہی لفظ زبان سے نکلا تھا کہ کانپنے لگی اور اٹھ کے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے مگر جب کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان سے آ کر بیٹھ گئی اور بولی ”حسین، اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے واپس جانے کا وقت آ گیا ہے۔

حسین: (بے صبری سے چلا کے) کیا؟ ابھی سے؟ نہیں، میں ابھی نہ جاؤں گا۔ یہ کہہ کے زمرد کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر پکڑ لیا۔

زمرد: ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی زیادہ بے صبری دکھاؤ گے، اتنے ہی زیادہ خراب ہو گے۔ اس وقت تہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اسے غنیمت سمجھو اور جو میں کہتی ہوں سنو! کوئی آ گیا تو یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ عمر بھر کفِ افسوس ملوگے۔ ساری دنیا میں بھٹکتے پھر دگے اور مطلب نہ نکلے گا۔

حسین: (اپنے آپ کو سنبھال کر) اچھا سُنتا ہوں۔ پیاری زمرد، تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ تو کام چلے گا (یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ جی بھر آیا اور زار و قطار رونے لگا۔)

زمرد: (اپنے نازک ہاتھ سے منہ بند کر کے) کیا غصب کرتے ہو! خدا کے لیے سنبھلو۔ دنیا میں

جائے جی بھر کے رو لینا۔ مگر ابھی میری ایک بات ذرا ہوش و حواس درست کر کے سُن لو۔

حسین: (نہ رکنے والے جوش کو روک کے) کہو، پیاری زمرد! دل و جان سے سُن رہا ہوں۔

زمرد: یہاں سے جانے کے بعد پہلے تم کوشش کرنا کرو، ہی لوگ جن کی مدد سے اس دفعہ یہاں آئے انھی لوگوں کی اطاعت کر کے، انھیں خوش کر کے، پھر یہاں آنے کا موقع پاؤ۔ اپنی حاجت روائی کے لیے تم ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کرنا اگر وہ تمھیں یہاں بھیجنے کا وعدہ نہ کریں اور سب طرف سے مایوس ہو جاؤ تو پھر اس وادی میں آکے ٹھہر جانا، جہاں میری قبر ہے اور جہاں خط بھیج کر میں نے تمھیں یہاں آنے کی تدبیر بتائی تھی۔

حسین: کوہ طالقان میں؟

زمرد: ہاں، ہاں۔ وہیں۔ اگر تم ایک مہینے تک وہاں ٹھہر و گے تو پھر میں کوئی تدبیر بتاؤں گی۔ دیکھو! خبردار کسی کو خبر نہ ہو کہ میں نے وہاں بلا یا ہے۔

حسین: مگر پیاری زمرد! وہ تدبیر اسی وقت بتا دو کہ یہاں سے جاتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دوں۔

زمرد: افسوس! تم نہیں سمجھ سکتے۔ بس تمھیں وہی کرنا چاہیے جو میں بتاتی ہوں۔ وہ تدبیر اس وقت بتانے کی نہیں۔

حسین: دیکھوں، اب کتنے دن ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

زمرد: صبر کرو اور ضبط سے کام لو۔ اور خبردار! ایسی کمزوری اور بزدلی نہ دکھانا کہ خودکشی کا ارادہ کرلو۔

حسین: میں اسی سے ڈرتا ہوں، پیاری زمرد، تیرے عشق میں بعض وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوتا ہوں اور نہ نیک و بد سمجھتا ہوں۔ یہ تیرے لیے ہی تھا کہ میں نے اپنے پچا اور شیخ الوقت امام نجم

الدین نیشا پوری کو قتل کر ڈالا۔

زمرد: میں جانتی ہوں، مگر اس میں مجھے شریک نہ کرو (کچھ آہٹ پا کے) اب خاموش رہو۔ ناگہاں چھسات حوریں ناز و انداز سے قدم رکھتی ہوئی سامنے آئیں اور محبت کے لجھے میں حسین سے کہنے لگیں:

”اب چل کے باہر کی سیر کچے اور ان نورانی تختوں پر جلوہ افروز ہو جیے جو چمنوں کے درمیان میں ہیں۔ اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے۔ شراب طہور کے جاموں میں خاص مزہ ہے۔“
حسین: میں تو یہاں تنہا ہی اچھا ہوں۔

زمرد: وہاں چلنے میں کیا مصلحت ہے۔ چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔

حسین: خیر، اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو مجھے کیا غدر ہو سکتا ہے۔ اتنی دیر میں اور سب حوریں بھی آ گئیں، اور زمرد حسین کو ساتھ لیے قصر زمردی کے باہر نکلی۔ سب کے سب لالہ زار کے درمیان میں طلائی تختوں پر جا کے بیٹھے۔ تخت کے دونوں جانب دو حوض تھے اور بغیر کہے صرف واقعات سے یقین دلا�ا جاتا تھا کہ ایک حوض کوثر اور دوسرا شراب طہور کا ہے۔ سامنے چند حوریں بیٹھے کے عجب دربا اور وجد میں لانے والی دھن میں گانے لگیں۔ دو چار غلامان یعنی دو بصورت کم عمر کوڑ کے سونے کے جام و صراحی لا کے کھڑے ہو گئے اور نغمہ و سرود کے ساتھ دور بھی چلنے لگا۔ دو جاموں نے حسین پر از خود رفتگی کی کیفیت پیدا کر دی اور جب وہ اس عالم نور کو بے خودی کی نیم بازاں نگھوں سے دیکھ رہا تھا، اُسے نظر آیا کہ زمرد ایک ہاتھ تو اس کے گلے میں ڈالے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھلکتا ہوا جام اس کے منہ سے لگا رہی ہے۔ حسین اس لطفِ صحبت کا دل ہی دل میں مزہ اٹھا کے اس جام کو پی گیا مگر پینے کے بعد معلوم ہوا جیسے زمرد کی آنکھوں سے متیوں کی طرح

آنسوٹپک رہے تھے۔ بے ہودی کے جوش میں پیاری دل ربا کی دل دہی کے لیے بڑھنے ہی کو تھا کہ مد ہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اس کے بعد اُسے اپنے پرانے کی خبر نہ تھی۔

پھر وہی عالمِ عناصر

دیر کی آزار ساں غفلت و بے ہوشی کے بعد حسین ذرا ہوشیار ہونے لگا تھا کہ کان میں آواز آئی ”
اے جسم خاکی! اٹھا اور اس برزخ کبری کا ہاتھ چوم جو تیرا امام ہے اور جس نے تیرے لیے باوجود
محرِ محض ہونے کی صورت ماؤ دی اختیار کر لی ہے۔ حسین نے بے ساختہ آنکھ کھول دی اور بجائے
جنت یا زمُرد کے پہلو کے اپنے آپ کو اس تاجدار شخص کے سامنے پایا جس کے ہاتھ پر اس نے
بیعت کی تھی اور جو اس سفرِ جنت کی آخری منزل پر ملا تھا۔ حسین آنکھیں ملتا ہوا ادب سے اٹھ بیٹھا
اور اس کے قدموں پر گر کر سر رکڑ کر کہنے لگا:

مُكْنَى بیدار ازیں خوابِ مُخدارا!

شخص: نہیں۔ تجھے پھر عالمِ ارضی میں جانا ہے۔ میرا یہ ہاتھ جس میں نور کے ماؤ کے کا بہت کم جزو
ہے، تیرے ہاتھ سے مل چکا ہے اور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہتا ہے جن کے وسیلے سے تیری
اس ملائِ عالیٰ تک رسائی ہوئی۔

حسین: مگر میں ابھی چند روز اور جنت میں رہنے کا آرزو مند ہوں۔

شخص: اس ماؤ دی عالم کی زندگی میں ممکن نہیں کہ تو اس روحانی عشرت کدے میں جا سکے۔ جا اور
اس وقت کا منتظر رہ جب کسی ذیلی کوشش یا امامِ مرشد کے حکم سے تو جامِ فنا پیے گا۔

حسین: آپ میرے امام ہیں اور آپ ہی جامِ فنا پلًا کے مجھے فردوسِ بریں میں پہنچا دیجیے۔

شخص: یہ ملائِ عالیٰ کی سرحد ہے اور یہاں فنا نہیں۔

اتئے میں وہی پہلی پری ویش ناز نین لبریز جام ہاتھ میں لیے ہوئے آئی، جس کے دیکھتے ہی اس

شخص نے کہا ”بس، اب زیادہ ٹجت نہ کر اور یہ شراب طہور کا آخری جام پی۔“ یہ کہہ کے اُس نے جام اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھایا۔

حسین اب جانتا تھا کہ یہ شراب طہور داروئے بے حوشی کا اثر رکھتی ہے اور جس طرح اُس کا نشہ پہلے اُسے عالمِ نور میں لے گیا تھا، اب خصیضِ ظلمت میں لے جائے گا۔ مگر ماپوتی کی تکلیف نے پیاس اس قدر تیز کر دی تھی کہ انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ بے تکلف لے کے پی گیا۔ تحوڑی تحوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کھول کے وہ مختلف سین دیکھنے لگا جو حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھے۔

آخر ایک شب کو اس کی آنکھ شیخ الجب کے سامنے کھلی۔ اس پہلے نگہبان نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کے کہا ”حسین! تو پھر اس تیرہ خاکِ دانِ عنصری کے حدود میں آ گیا اور ان آنکھوں سے جو انوارِ محفوظہ و مجردہ دیکھ چکی ہیں، پھر نورِ سینا کو اسی طرح ستر جابوں میں دیکھ رہا ہے۔“

حسین: (آبدیدہ ہو کے) مگر میں تو اس ظلمتِ خاکی میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

طورِ معنی: بے شک نہ چاہتا ہو گا۔ جذبات نور وحدت ایسی ہی کشش رکھتے ہیں مگر کیوں کر ممکن تھا کہ اس جسمِ خاکی کا دھبا اُس نورستان میں ہمیشہ قائم رہتا۔

حسین: تو اللہ کو شش کیجیے کہ اسی وقت اس جسمِ خاکی کو چھوڑ کے اُس سرو شہستانِ اعلیٰ کا راستہ کہیں، اُس پر عمل کرو۔

طورِ معنی: ان امور میں شیخ علی وجودی ہی تمہارا اطمینان کر سکتے ہیں۔ اُن کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں، اُس پر عمل کرو۔

حسین: (جو شِ دل سے نوحہ و بکا کر کے) افسوس! میری اتنی ریاضت اور یہ مدتؤں کی آرزو

مندی صرف اتنے مختصر زمانے کے لیے تھی! آہ! کیا کروں کہ پھر زمر دکا وصال نصیب ہو! یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کے اور زارقطار رونے لگا اور یہاں تک رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

طورِ معنی: اے بلند حوصلہ مُشت غبار! میرے عزلت کدے کو خالی کراو صفحہ، هستی پر جا کے اس معیادِ معینہ کو پورا کر، جتنے دنوں کے لیے تو اس ظلمت کدہ ارض میں گرفتار ہے۔

حسین: کاش! یہ بھی معلوم ہوتا کہ اس مُشت غبار کو کب تک اس عالم میں سرگردان پھرنا اور خاک اڑانا ہے۔

طورِ معنی: تیرے لیے ان رموز کا ظاہر کرنا شیخ علی وجودی کا کام ہے۔ اس لیے وہی تیرے مُرشد ہیں۔ مگر ہاں، تجھے ایک راز بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ پھر اُس عالم نور کی زیارت فقط اُس امام کے اختیار میں ہے جو لاہوت و ناسوت کا برزخ اور تجھی ہے۔ وہ تجھی جو مختلف جسد ہائے امامت و نبوت میں ظاہر ہوتی رہی۔

حسین: مگر ان تک رسائی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور ملاعِ اعلیٰ سے پھر میں اس قعرِ ظلمت میں پھینک دیا گیا تو؟

طورِ معنی: گوآن کامر کو مقرر رہی نورستان اعلیٰ ہے مگر یک گونہ تعلقاتِ مادہ جن کی وجہ سے انہوں نے بہت سے جسید ہائے امامت بدالے، انھیں اکثر اوقات اس آنحضرتیان میں سمجھنے لاتے ہیں۔ مگر بغیر مُرشد کے اس غرض میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر تو اصرار کرے گا تو تیرے مُرشد شیخ علی وجودی تیری اس امر میں مدد کریں گے۔ پس اب تو اس خلوت کدہ نور کو خالی کر اور مُرشد کی قدم بوسی کے لیے روانہ ہو۔

اس تقریر نے امید کا ایک دھنڈا چراغ اس کے سینے میں روشن کیا جس کی روشنی میں وہ غار سے

باہر نکلا۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی انہتانہ تھی جب دیکھا کہ کاظم جنوبي غار کے دہانے پر اسی وضع اور حالت میں کھڑا ہے جس وضع و حالت میں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ کاظم جنوبي نے اس کی صورت دیکھتے ہی کہا: ”اب تو تم کو اطمینان ہو گیا کہ شجرِ معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔“

حسین: اور آپ یہاں کب آئے؟

کاظم جنوبي: ابھی تمہارے ساتھ ہی آیا ہوں۔

حسین: ابھی؟

کاظم جنوبي: ہاں، ابھی۔

حسین: مجھے تم سے رخصت ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔

کاظم جنوبي: (ہنس کر) اس عالم اور اُس عالم میں بڑا فرق ہے۔ یہاں کا ایک ایک دن وہاں کے سنتر برس کے برابر ہے۔

حسین: وہ ایک گھری سہی، مگر تم یہاں پھرے کیوں رہے؟

کاظم جنوبي: امامِ قائم قیامت کا حکم یہی تھا۔

حسین: امامِ قائم قیامت کون؟

کاظم جنوبي: وہی جن کے ہاتھ پر اُس عالمِ نور کے سفر میں تم نے بیعت کی ہوگی۔

حسین: مگر ان کے احکام تم تک کیوں کر پہنچ گئے؟

کاظم جنوبي: انھی مُرشد کے ذریعے سے جو راہِ طریقت طے کرنے کے لیے میرے اور ان کے درمیان واسطہ ہیں۔

حسین: تو شاید تمہارے مُرشد یہاں آئے ہوں گے؟

کاظم جنوبی: اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ وہ ایک توجہ سے اپنے خیالات میرے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔

حسین: افسوس! میں جنت سے زبردستی کھینچ کے نکلا گیا۔

کاظم جنوبی: ان امورِ ربانی کی شکایت نہ کرو۔ اور ان کے مصالح دریافت کرنا ہیں تو اپنے مرشد شیخ شریف علی وجودی کے پاس جاؤ۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اب تم عالم نور کی سیر کر آئے ہو، لہذا ان کو اسی روحاںی لقب سے یاد کرنا جو اس سرو شہستان میں مشہور ہے۔

حسین: کیا اُن کا کوئی اور بھی لقب ہے؟ میں نے سنانہیں۔

کاظم جنوبی: ہاں، اس عالمِ عناصر میں تو ان کا نام یہی ہے جو تم جانتے ہو، مگر اس عالم نور میں وادی ایمن کہے جاتے ہیں۔

حسین: (تعجب سے) وادی ایمن! (اور پھر سوچ کے) بے شک، انہیں وادی ایمن ہی کہنا چاہیے۔

انھی کے پہلو میں نور کی حقیقت کی پہلی شعاع نظر آئی۔

کاظم جنوبی: بس، اب چلو اور حلب کا ارادہ کرو۔

حسین: مگر مجھے اتنا ضرور بتا دیجیے کہ اس عالم نور میں کبھی پھر بھی میرا گور ہو سکے گا؟

کاظم جنوبی: اس امر میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ مگر ہاں، یقینی ہے کہ اگر تمہارے مرشد کی توجہ ہو تو سب با تین ممکن ہیں۔

کاظم جنوبی نے اس جملے سے حسین کے سینے میں امید کے چراغ کو ذرا اور اکسا دیا۔ آخر دونوں نے اس وحشت ناک مسکنِ دام و در کو چھوڑا اور شہر اصفہان میں آئے۔ کاظم جنوبی نے اپنی مسجد

کے دروازے پر پہنچتے ہی آواز لگائی ”دھنِ سگ بِ لُقْمَهِ دو ختہ بہ“، جس کے بعد حسین نے اُسے رخصت کیا اور شہر حلب کی راہ لی۔

اس سفر میں حسین ہر وقت جنت اور اس کی حوروں کی اُدھیر بُن میں رہتا۔ اگرچہ اس کا جسم اس دنیا میں تھا لیکن اُس کے خیالات اور اُس کے اعتقاد میں اُس کی روح علیٰ اللہ وام اُس دوسرے عالمِ نور کے مزے لیتی رہتی۔ وہ خیال میں کہتا ”اتنے انقلابات کے بعد اب مجھے تو یہ معلوم ہو گیا کہ

”مُؤْتُوْ أَقْبَلَ أَنْ تَمُؤْتُوا“، کے کیا معنی ہیں یا اس دنیا میں رہنے سہنے کے ساتھ انسان اس عصرستان سے قطعِ تعلق کر کے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ عالمِ ملکوت میں کیوں کر صرف کرتا ہے۔ اب اس مرتبہ جب کہ وہ اصفہان سے حلب کو جا رہا تھا، اُسے ایک بہت ہی نئی حرمت میں ڈالنے والی چیز نظر آئی۔ وہ جس گاؤں یادشتو وده میں گزرتا، اکثر لوگ خود بخود اسے پہچان لیتے کہ جنت کی سیر کر آیا ہے اور پاس آ کے مبارک باد دیتے۔ وہ دل میں پریشان تھا کہ یہ کیا بات ہے اور کون سی علامت ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو میری حالت معلوم ہو جاتی ہے! بعض لوگوں سے اس راز کو دریافت بھی کیا مگر کسی نے ٹੁکڑہ نہ بتایا، زمرد اب اس کے دل و دماغ پر پہلے سے زیادہ حاوی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جا گئے ہر حالت میں اس کی دلفریب تصویر پیشِ نظر رہتی۔ کبھی اپنی طرف بُلاتی تھی اور کبھی صبر و تحمل کی تاکید کرتی تھی۔ یہی پریشان کن خواب دیکھتا ہوا شہر حلب میں پہنچا اور شیخ علی وجودی کے سامنے جاتے ہی ان کے قدموں پر گرا۔ شیخ نے اُٹھا کے پیشانی پُرمی اور پیٹھوںک کے اپنے برادر بُٹھایا اور کہا ”اے حسین! تو لا ہوت اکبر کی سیر کر آیا۔“

حسین: یا شیخ! اُس عالمِ نور کی میں نے پوری کیفیت دیکھ لی ہے اور اے وادی ایمن! تیرے

پہلو میں مجھے وہ جلوہ نظر آ گیا جس کے اشتیاق کے سوال پر موی کو بھی ”لُکن ترانی“، کا جواب ملا تھا۔ مگر کیا کہوں کہ میں نے کن حستوں سے اس خطہ نور کو چھوڑا ہے۔

شیخ: اے تیرہ و تارِ مشت غبار! بتاتونے وہاں کیا دیکھا؟

حسین: ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی۔

شیخ: جذباتِ نور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زمرد سے ملا تھا؟

حسین: (شیخ کے قدم چوم کے) ملا تھا۔ آہ! جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ نظر کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

شیخ: مگر تیرا جسمِ خاکی اُس نورستان میں زیادہ دری نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اگر چہ تو کہتا ہے مجھے یقین ہے کہ اُس عالمِ نور کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مگر اے حسین، میں کہتا ہوں کہ تو نہیں دیکھا۔

حسین: نہیں، اے شیخ اور اے وادی ایمن! میں نے دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھ رہا ہوں۔

حسین کا یہ جواب سُنتے ہی شیخ کو جال گیا۔ منه میں کف بھرا آیا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ جوش میں آ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسین مارے خوف کے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ انہوں نے کہنا شروع کیا ”اے مغلبر و مغر وِ مشت خاک! تیری کیا مجال کہ اس نورِ لمبیز لکوان ذلیل آنکھوں سے دیکھ سکے۔ تیرے جسم کے سامنے وہ تو غیر متغیر بن کے نمایاں ہوا تھا۔ اس کی اصلی کیفیات کو تیری یہ آنکھیں کسی طرح معلوم نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ہاں، تو اُس کو دیکھے گا اور اُس کی اصلی حالت و کیفیت میں دیکھے گا۔ مگر کب؟ اس جسمِ خاکی کو چھوڑ کے اور مجرِ محض بن کے۔ اُس وقت تجھے یہ بھی نظر آ جائے گا کہ اُسی نورِ ازل کا چراغ تو بھی ہے۔“

حسین: (کا نپتی آواز سے) مگر میں تو ابھی وہاں سے آنا نہیں چاہتا تھا۔

شیخ: بے شک نہ آنا چاہتا ہو گا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ نور کثافتِ ماڈہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حسین: لیکن اے شیخ! آپ وادیٰ ایمن ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں پھر اس عالمِ نور میں جا سکتا ہوں۔ آہ! زمرد کے لیے بہت پریشان ہوں۔

شیخ: (پھر طیش میں آکے) اگر ہوں است ہمیں قدر بس است۔ اس سرو شہستان کو بے دیکھے قبول کرنے کی زحمت نہیں دی جاسکتی۔ آگ میں کسی ماڈی چیز کو ڈال دو تو وہ اپنا تصرف کرنے کے بعد باقی ماندہ کثافت کو الگ پھینک دیتی ہے۔ اسی طرح نورستان نے تیرے جسم کو اپنے حیز سے نکال کے پھینک دیا ہے۔

حسین: تو پھر آپ ہی اپنے ہاتھ سے مجھے اس جسم خاکی کی قید سے آزاد کیجیے تاکہ تحرداً اختیار کر کے جاؤں اور پیاری زمرد کو اپنے آغوش میں لے لوں۔ کیا عجب کہ اس وقت تک وہ میرے شوق میں اپنا آغوش پھیلائے ہوئے ہو۔

شیخ: اب وہاں تک تیری رسائی امام قائم قیامت کی دشیگری سے ہو سکتی ہے۔

حسین: گو میں اس برزخِ کبریٰ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں مگر اس درگاہ میں میری رسائی اسی وقت ہو گی جب آپ میری مدد کریں۔ آپ کی دشیگری سب پر مقدم ہے۔

شیخ: اچھا، مایوس نہ ہو، مجھے تیرا ایک دفعہ اور امتحان لیما ہے۔ اگر تو اس امتحان میں پورا اُتر اتو میں تجھے اس دربارِ امامت میں سفارش کے ساتھ پہنچا دوں گا۔

حسین: جلدی فرمائیے۔ جو حکم ہو، اس کو بجالانے کو تیار ہوں۔ موت کا سب سے زیادہ آرزو مند ہوں۔ اگر اس امتحان میں مجھے موت نصیب ہو گئی تو اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہے۔

شیخ: اسی وقت شہر دمشق کی راہ لے اور جس طرح بنے امام نصر بن احمد کو جو ہم باطنیں کے خلاف وعظ کہا کرتے ہیں، قتل کر کے واپس آ۔

حسین: ابھی چلا۔ مگر مجھے اتنا اور بتا دیجیے کہ کیا ہم ہی وہ باطنیں ہیں جن کو کبھی لوگ قرامط کے اور کبھی ملاحدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں؟

شیخ: بے شک۔ ہم اسماعیل بن جعفر صادقؑ کی امامت کے مدعی ہیں۔ اور چونکہ امامت ظاہر ہو گئی، لہذا ہم پر فرض ہے کہ اس کی تبلیغ و نقابت خفیہ اور باطنی طریقوں سے کریں۔ انوارِ ازل نے یہ قدیم ہی سے فیصلہ کر دیا ہے کہ جب تک امامت ظاہر رہتی ہے، نقابت و تبلیغ خفیہ ہوتی ہے، اور جب امامت مخفی و باطنی ہو جاتی ہے تو نقابت و تبلیغ علانیہ ہونے لگتی ہے۔

حسین: مگر اس کا سبب میرے ناقص فہم سے بالاتر ہے۔

شیخ: بے شک بالاتر ہے (زور سے گھور کے) اور تیرے جاہلانہ شکوک اسے اور زیادہ بالا کرتے جاتے ہیں۔ خود خدا کی طرف خیال لے جا کر وہ مخفی ہے اور اسی لیے اُس کی توجہ کی تبلیغ علانیہ ہوتی ہے۔

حسین: یا وادی ایمن! نبوت تو ظاہر ہی اور اس کے ظہور کے زمانے میں برابر علانیہ تبلیغ ہوتی تھی۔

شیخ علی وجودی کے منہ میں کف بھرا آیا۔ سخت برہمی کے لبھ میں وہ چلا گئے ”ابھی تک شیطان تیرے دل میں بیٹھا ہے، وہ تجھے بہکار ہا ہے اور عالمِ نور میں جانے کی آرزو رکھتا ہے۔ سُن! اس نظام کا تعلق صرف امامت سے ہے۔ نبوت ہمیشہ ظاہر ہی اور ظہور کے زمانے میں علانیہ تبلیغ ہوتی رہی۔ نبوت اور رسالت کس چیز کی طرف لوگوں کو بُلاتی ہے؟ خدا کی طرف اور فردوسِ بریں کی

طرف۔ اور یہ دونوں دنیا کی نظر میں مخفی ہیں۔

حسین: (ڈرتے ڈرتے) مگر امامت بھی تو انھی چیزوں کی طرف بُلاتی ہے۔

اب شیخ کو غصے نے آپ سے باہر کر دیا۔ ایک دفعہ چمک کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا ”تو عالم ہور کی سیر کرنے پر بھی جاہل اور شکلی ہے۔ عہدِ نبوت میں جنت اور نور الانوار اس قدر نمایاں نہ تھے جتنے کہ اب عہدِ امامت میں ہیں۔ رسالت نے کبھی کسی ماڈی پیکر کو اس سروشہستان میں نہیں بھیجا اور امامت برادر بھیج رہی ہے، جس کا یہ قطعی نتیجہ ہے کہ فردوسِ بریں اور نورِ ازلی پہلے مخفی تھے اور اب نمایاں ہیں۔ اور چونکہ اب نمایاں ہیں لہذا تبلیغ اور نقاہت کو خفیہ طریقوں سے ہی اپنا عمل کرنا چاہیے۔

حسین: یا وادیِ ایمن! اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ اور ضرور تھا کہ اپنے شکوہ رفع کرتا۔ اس لیے کہ میں نے اس مذہب کی نسبت بہت سی بے سروپا باتیں سنی تھیں۔ سُنا تھا کہ الموت کے قلعے میں لوگ طرح طرح کے فریبوں سے اس مذہب کے پابند بنالیے جاتے ہیں۔

شیخ: یہ دشمنوں اور جہلا کی افترا پر دازیاں ہیں۔ ایسے لوگ جن کو چشمِ بصیرت نہیں اور انوارِ ازلیہ کے سامنے خفاش سے زیادہ وقت نہیں رکھتے، ان کے کہنے کا کیا اعتبار۔ اتنے مدارجِ یقین طے کر کے تجھے نظر آ گیا ہو گا کہ ہم کس ملائِ اعلیٰ پر ہیں اور کس آسمانی سے سروشہستان کی سیر کراتے ہیں۔ اور وہ کس قعرِ جہالت میں پڑے ہیں اور کس تحفہِ انحرافی کی طرف روز بروز زیادہ دھستے چلے جاتے ہیں۔

حسین: مجھے معلوم ہے۔

یہ کہہ کر حسین شیخ سے رخصت ہوا اور امام نصر بن احمد کی جان لینے کے لیے دمشق کی راہیں۔

حسین اب ایسے کاموں کے لیے جری تھا۔ پہلے موقع پر جوشہ بات اُس کے دل میں پیدا ہوئے تھے، اب نام کو بھی نہ تھے۔ اس کو یقین تھا کہ جنت یقیناً ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کا وہ معتقد ہے۔ اور ان کے اشارے پر بُرے بھلے کام کا کرنا ہی ذریعہ نجات ہے۔ باوجود اس کے ایک جلیل القدر عالم کے قتل میں اُس کے دل نے کسی قدر پس و پیش ضرور کیا۔ مگر شیخ اور زمُرد کے خیال نے پھر اس کا دل آگے بڑھایا۔ وہ نہایت سُنگ دلی کے ساتھ مُرشد کے وحشیانہ حکم کی تعمیل کے لیے دمشق میں پہنچا اور امام نصر کے عقیدت کیشوں میں شامل ہو گیا۔

اس سفر میں بھی وہ حیرت سے دیکھتا تھا کہ بعض لوگ را چلتے چلتے پہچان کر اُس سے بغلگیر ہوتے اور یک جھقی واخوت کا ثبوت دیتے، جس سے اسے یہ بھی نظر آ جاتا تھا کہ اس کے ہم عقیدہ و ہم خیال کس کثرت سے دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خوش نصیبی یادل کی بے صبری سے مہینے ہی بھر میں اسے اپنی غرض حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک رات پچھلے پھر جب کہ امام نصر پڑوں کی مسجد میں اور سب سے چھپانے کے لیے اندر ہیرے میں تن تہا کھڑے نمازِ تجداد ادا کر رہے تھے، حسین کا خبر اُن کے دل میں اُتر گیا۔ جب لاش بالکل ٹھنڈی ہو گئی تو پچھلی رات کے سنائے ہی میں مسجد سے نکل کے چلا گیا اور راستے میں ایک نہر کے کنارے بیٹھ کے اپنے کپڑے دھو کر حلب کو روائے ہوا۔

شیخ علی وجودی نے اس کی کارکردگی کی داد دی اور اس کی پیٹھ تھونک کے کہا کہ حسین تو مرافق یقین کو بہت جلد طے کر رہا ہے اور اپنے اغراض میں کامیاب ہو گا۔

حسین: یا وادی ایمن: مجھے ایک امر پر بڑی حیرت ہے، میں جہاں جاتا ہوں اور جس جگہ جاتا ہوں،

میرے ہم خیال و ہم عقیدہ صورت دیکھتے ہی مجھے پہچان لیتے ہیں اور میں ان کو نہیں پہچان سکتا۔
یہ سُنْتَهِ ہی شیخ نے ایک صندوق سے ایک آئینہ نکالا اور اسے دکھا کر کہا کہ اپنی صورت دیکھ، تجھے
اپنے چہرے پر کوئی چیز نظر آتی ہے؟

حسین: ہاں، پیشانی پر داغ ہے۔ مگر معلوم نہیں کیسا داغ ہے۔ شاید بچپن میں کبھی کہیں گر پڑا
ہوں گا۔

شیخ: (مسکرا کے) نہیں۔ یہ حور کے بو سے کا نشان ہے۔ یہی ایک مُہر ہے جو ہمیشہ اس بات کا
ثبوت دیتی ہے کہ انسان اپنے قفسِ عنصری کے ساتھ فردوسِ بریں کی سیر کر آیا ہے۔

حسین: تو جن لوگوں نے مجھے پہچانا، غالباً ان کی پیشانیوں پر بھی حور کے بو سے کا نشان موجود
ہو گا۔

شیخ: بے شک ہو گا۔ اور حسین! دیکھ میری پیشانی پر موجود ہے۔

حسین: (شیخ کی پیشانی پر بھی وہی اپنا ساداغ دیکھ کر) بے شک۔ یہ مدارجِ یقین طے کرنے کا
تمغا ہے۔

شیخ: حسین! یہ بہت بڑی چیز ہے۔ مرنے کے بعد سب مومنین جنت میں جائیں گے۔ مگر جو
لوگ دنیاوی زندگی ہی میں اُس مرکِ نور کی سیر کر چکے ہیں، ان کا یہ خروہاں بھی موجود رہے گا۔ یہ
 DAG وہاں پیشانیوں پر نور کی طرح چمکے گا اور عام ناجیوں میں ہم لوگوں کو ممتاز ثابت کرے گا۔

حسین: مگر مجھے یہ داغ دنیا ہی میں عزیز ہے۔ کاش! میرے لب میری پیشانی تک پہنچ سکتے
کہ میں اس داغ کو بو سے دے کے اپنے دل کی تسلی کرتا۔ میری پیشانی پر سوائے زمرد کے اور
کسی کے بو سے کا نشان نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے بو سے لیے ہیں تو صرف اُسی کے لب لعلمیں

نے۔ مگر افسوس! جس طرح زمر دمیرے دل میں ہے، ہاتھ میں نہیں آ سکتی، اسی طرح اس کے بو سے کانشان ہر وقت میرے پاس ہے اور مجال نہیں کہ اپنے مشتاق ہونٹوں کو وہاں تک پہنچا سکوں۔

شیخ: اب ان شاعرانہ خیالات کو دور کرو اور امام قائم قیامت کی قدم بوسی کیلئے تیار ہو جاؤ۔
حسین: لمیک! مگر اے وادی! ایکن! اتنا اور بتا دیجیے کہ ان کو امام قائم قیامت کیوں کہتے ہیں؟

شیخ: یہ بھی رمز ربانی میں سے ایک ذمہ ہے۔ تجھے شاید ابھی تک ان ائمہ کے نام بھی نہیں معلوم نہ ہوں گے جو نورِ لمیز کی شعائیں ہیں اور مختلف جسدوں سے نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ یہی ائمہ ہمیشہ ناسوت اکبر ہوتے رہتے ہیں۔ وہی وجود آدم، نوح۔ ابراہیم، موسیٰ، داؤد، سلیمان، عیسیٰ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین کے اجسادِ مطہرہ سے جلوہ فلکن ہوتا رہتا تھا۔ آخر علی مرتضیٰ کے جسد انوں میں نمودار ہوا۔ اور چونکہ اب نبوتِ ختم ہو چکی تھی، لہذا ایک روح نے مختلف اجساد بد لنے شروع کیے۔ پھر حسین اور علی زین العابدین و محمد باقر علیہم السلام کے اجساد کی سیر کرتے کرتے وہ نور جناب جعفر صادق کے جسد انوں سے نمایاں ہوا اور وہ زندہ ہی تھے کہ ان کے پیکر جسدی کو چھوڑ کے پہلے جناب اسماعیل میں پھر محمد مکتوم ابن اسماعیل میں جو سانچ امام تھے آیا۔ چند روز تک وہ نور سلسلہ وار امام منصور بن محمد مکتوم جعفر صادق اور حبیب بن جعفر کے اجسام مطہرہ میں خفیہ ہی خفیہ لمعہ فلکن رہا۔ جناب اسماعیل سے اس وقت تک امامت مخفی ہی رہی۔

اب یکا کیک اس نور نے عبید اللہ مہدی کی ذات سے نمایاں ہو کے اپنی پوری تنور دکھا دی اور امامت ظاہر ہو گئی۔ اس کے بعد سے وہ نور بر ابر علائیہ طور پر مختلف اجسادِ ظاہرہ کو بدلتا رہا۔ پہلے قائم

بامِ اللہ کے جسم سے، پھر منصور کے پھر مُغزالین اللہ کے جسم سے چمکا۔ متقر باللہ کے بعد پھر حسن بن محمد یعنی علی علیہ السلام پھر محمد بن علی علیہ السلام کے جسموں کے لا بیت کبریٰ کا درجہ پایا اور فی الحال وہی انوارِ ازلی رکن الدین خورشاد کے جمالِ جہاں آ را سے نمودار ہیں جو فرمائز وائے الموت ہیں۔ وہ امام قائم قیامت برزخِ اکبر ہیں اور لاہوت و ناسوت و تجلی ہیں جو مختلف جسد ہائے امامت و نبوت سے لمعہ فلکیں رہی ہیں۔

حسین: (حیرت سے) وہی جن کے ہاتھ پر میں نے اس عالمِ لاہوت میں بیعت کی تھی؟
شیخ: وہی۔

حسین: مگر آپ تو فرماتے ہیں کہ وہ الموت کے فرماں روایت ہیں؟
شیخ: بے شک۔ مگر یہ علاقِ دنیوی اُن کے تجربہ اور ان کی اس نورانیت کو جو عالمِ سروش میں لے جاتی ہے، دُھندا نہیں کر سکتے۔ امامِ دینی اور عام لوگوں میں یہی فرق ہے کہ جس چیز کو ہم ریاضت سے حاصل نہیں کر سکتے وہ انھیں بدرجہِ اتم حاصل رہتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ عالمین برزخ کہے جاتے ہیں۔

حسین: اور وہ امام قائم قیامت کیوں کہلاتے ہیں؟
شیخ: (کسی قدر برہم ہوتے ہوئے رُک کر) ہاں۔ میں نے اس کا راز ابھی نہیں بتایا۔ اما میں مستنصر وزنار کے عہد میں ان میں انوارِ ازلی کی ایک نئی اور غیر معمولی شمع روشن ہوئی تھی۔ گویا شمع دراصل قدیم نورِ امامت کا انعکاس تھی مگر اتنا بڑا انعکاس کامل کہ اس کے جلوے سے تمام ممالکِ ارض چمک اٹھے۔ اس سے وہ چراغ نور مراد ہے جو صبح کے جسمِ صافی میں چمکا تھا۔ یہ لقب قائم قیامت اسی آئینہ پر تو نورِ ایزدی کا ہے جس نے یک یک حدودِ مدارِ اعلیٰ اور نورستان میں

پہنچ جانے کے اتنے صحیح ذریعے مخلوق میں پیدا کر دیے کہ ادنیٰ لوگوں کو وہ کمال حاصل ہو گیا جو گز شتہ عہدوں میں انبیاء اور ائمہ کے سوا کسی کو حاصل نہ تھا۔ پہلے کوئی فردوسِ بریں میں جانے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا مگر اب اس اعلیٰ پر تو ایزدی کو ظہور کے بعد یہ حالت ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے ایک دم میں اُس عالمِ نور کی سیر کر آتا ہوں۔ اور تم بھی اس سروشہستان میں جانے کے ہوروں کی ہم کناری کامزہ اٹھا آئے ہو۔ قیامت کے معنی ظاہر پرستوں میں اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ مگر حقیقتِ شناس جانتے ہیں کہ قیامت صرف اُس حالت یا اُس وقت کا نام ہے جب کہ مخلوق کو خالق سے یا پرتو کو نور سے قربت ہو جائے۔ حسن بن صباح نے چوں کہ اپنے عہد سے مخلوق کو ایسے تقریب کے درجے پر پہنچا دیا لہذا وہ امامِ قائم قیامت کہلاتے ہیں یعنی وہ امامت جس کی بدولت مخلوق اور خالق میں قربت ہو گئی اور اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ ان کے چند ہی روز بعد امام علیٰ ذا کرۃِ السلام میں امامتِ قدیمہ جو جناب علیٰ مرتضیٰ سے نسلًا بعد نسلِ چلی آتی تھی۔ نیز وہ امامتِ قائم قیامت جس کا چراغ پہلے پہل حسن بن صباح کے اخیر میں روشن ہوا دونوں امامتیں جمع ہو گئیں۔ اور یہاں ایک انوارِ نور میں یہجاں میں آگئے۔ بس اسی دن سے تمام تکلیفاتِ شرعیہ بندوں پر سے اٹھادی گئیں۔ رمضان کی ۲۷ کو اس قربتِ پر نور کا جلوہ نظر آیا تھا اور مومنین شرعی ان قیدوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اسی سبب سے وہ دن ہمارے لیے عید ہے۔

حسین: (متغیر ہو کے) مگر میں تو دیکھتا ہوں کہ آپ شب و روز ریاضت ہی میں مشغول رہتے ہیں اور آپ ہی کی طرح اس فرقۃ ناجیہ کے جتنے پیرو مجھے ملے، سب پابند شرع، بڑے محتاج اور بڑے متلقی و پرہیز گا نظر آئے۔

شیخ: جو لوگ عرفان و حقیقت کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں، ان کو مشکلاتِ ریاضت طے کرنی پڑتی ہیں۔ مگر مومنین پر فرض اب کوئی عبادت نہیں۔ خاصتہ اُن برگزیدگانِ کم ریزی کے لیے جو امام قیامت سے تقریب رکھتے ہوں۔

حسین: مگر اے وادی! ایک من! میرا دل آپ کی توجہ کا محتاج ہے۔ تکلیفات شرعیہ کا اٹھا دینا ایک ایسی چیز ہے جس سے میرے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں۔

شیخ: (برہمی کے ساتھ) اتنے مدارج طے کرنے پر بھی شک؟ سرو شہستانِ عالمِ نور کی سیر کر چکنے کے بعد شک؟ اب یہ شک نہیں، گستاخی ہے۔ جانتا ہے کہ ساری عبادتیں خدا و مدخلِ علیٰ کی قربت حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ اور جب وہ قربت حاصل ہو جائے تو پھر کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم نے سنا ہے اور دیکھ بھی لیا ہو گا کہ جنت میں کوئی شخص عبادت کا مکلف نہیں۔ اس کا یہی فشاش ہے کہ ہم قربانِ نوارِ کم ریزل کے لیے عبادت کرتے ہیں اور وہاں ہر ایک کو یوں ہی حاصل ہوتا ہے۔

حسین: بے شک۔ وہ منزلِ مقصود ہے اور عبادت اس کا راستہ۔ جنت میں پہنچ جانے کے بعد فی الحقیقت کسی عبادت کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو لوگ ابھی اس کے باہر ہیں ان کی نسبت نہیں کہا جاسکتا کہ منزلِ مقصود کو پہنچ گئے یا چل رہے ہیں یا اس راستے میں ہیں لہذا ان کو عبادت کی بھی ضرورت ہے۔

شیخ: (انہا سے زیادہ از خود رفتہ ہو کے اور منہ میں کف بھر لائے) اس پیکرِ خاکی کو شبہات ہی نے خراب کیا ہے۔ یہ برادر شک کرتا ہے اور اپنے شکوک میں بڑا صدای ہے۔ سُن اے حسین! امامِ قائم قیامت نے جو اپنے آپ کو بتایا کہ وہ اس عالمِ نور میں ہیں اور جزوِ عنصری سے باہر اس

کے یہی معنی تھے۔ گو بظاہر ان کا جسد اس عالم مادی میں نظر آتا ہے مگر دراصل وہ ان ماذیات سے دور سرو شہستان اعلیٰ میں ہیں اور ان سے ملنے اور ان کے جوار میں رہنے کے یہی معنی ہیں کہ گویا انسان اس تیرہ کلمت کدہ ارض سے نکل کر لا ہوتا اکبر کے قریب جا پہنچا۔ پھر وہاں پہنچ جانے کے بعد عبادت کیسی؟

حسین: بجا ہے۔ میرا شہر دور ہو گیا۔ آپ کی تقریر سے ہمیشہ ایسے شکوہ دُور ہو جاتے ہیں، اور یہی اطمینان حاصل کرنے کے لیے میں اپنے شبہوں کو بلا تامُل آپ کی خدمت میں عرض کر دیتا ہوں۔

شیخ: خیر، تم اس امتحان میں بھی پورے اُترے ہو۔ اب تم کو امام علیہ السلام کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ جاؤ اور ان کے احکام کی بلا غدر اطاعت کرو۔ آج صفر کی ۲۰ ہے۔ رمضان کی ۲۷ کو عید قائم قیامت ہو گی۔ اس تاریخ کو میں بھی وہاں آؤں گا اور شیخ طورِ معنی بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اگر اتنے دنوں میں تم نے امام قائم قیامت پر اپنی عقیدت کیشی واطاعت کا پورا اثر ڈال دیا تو میں تمہاری سفارش کروں گا اور طورِ معنی بھی کریں گے۔ اور اسی وقت تم کو زمرہ سے ملنے میں کامیابی بھی حاصل ہو گی۔ مگر خیال رکھو کہ اُس اعلیٰ دربار میں انسان کے سر سے بہت سے تکلیفاتِ شرعیہ اٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کی اطاعت و عبادت صرف انقیاد ہے۔ اگر اس میں کوتا ہی ہوئی تو پھر اس کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ کسی اور شخص کے پاس۔ اس درگاہ کا راندہ مردود از لی اور رحمتِ الہی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہے۔

حسین: میں کسی حکم سے سرنہ پھیروں گا۔

شیخ: وہ ایسا مقام ہی نہیں جہاں تم اپنے دل کے شکوہ کو اسی بے تکلفی سے ظاہر کرو جس طرح

میرے سامنے کرتے ہو۔

حسین: کبھی کسی امر میں شک نہ کروں گا۔

شیخ: اگر اتنے مضبوط ہو تو کل صحیح تم یہاں سے روانہ ہو کر الموت کی راہ لو۔ میں ایک خط لکھ دوں گا۔ اسے لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہونا اور جب تک وہاں سے یا مجھ سے کوئی حکم نہ ملے، اُس دربار کو نہ چھوڑنا۔

حسین: ہرگز نہیں (یہ کہہ کے اس نے شیخ کے قدم چوم لیے)۔

دوسرے دن علی الصباح وہ شیخ علی وجودی سے خط سفارشی لے کے رخصت ہوا اور مشرق کی راہ لی ۔ چند روز میں بغداد واصفہ ان ہوتا ہوا علاقہ رُودبار میں پہنچا۔ اس سفر میں وہ اپنے ہم مذہبوں کو ہُوروں کے بوسوں کے نشان سے بے کچھ کہے سُنے پہچان لیا کرتا تھا، جو ہر شہر و قریہ میں ملتے تھے اور اس کے ساتھ نہایت ہی خلوص و عقیدت سے پیش آتے تھے۔ ویلم کے ایک گاؤں میں ایک باطنی شخص جو اپنی پیشانی کے نشان سے بتارہا تھا کہ وہ بھی جنت الفردوس کی ہوا کھا آیا ہے، حسین کو نہایت ہی خلوص و پاک دلی سے اپنے گھر لے گیا اور کئی دن تک مهمان رکھا۔

اُس شخص کے گھر پر ایک صحبت میں کئی ایسے باطنی جمع ہوئے جن کو اسی دو سال کے اندر جنت کی ہوا کھلانی گئی تھی۔ لوگوں نے صحبت کو اغیار سے خالی اور اپنے ہم عقیدہ و ہم خیال لوگوں ہی پر محدود دیکھ کے باہر جنت کا تذکرہ شروع کیا۔ اثنائے کلام میں ایک شخص بولا ”مگر مجھے جنت میں بھی ایک تمnarہ گئی۔“

دُوسرا: (حیرت سے) وہ کیا؟

پہلا: وہاں ایک ایسی دل فریب ناز نہیں نظر آئی کہ دل بے اختیار ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن خدا

جانے کیا بات تھی کہ ہزار کوشش کی مگر اس آفت زمانہ ہورنے بات کا جواب تک نہ دیا۔

دوسرا: واقعی تعجب کا مقام ہے۔ جنت میں تو ایسا نہ ہونا چاہیے۔ کسی ہور کی طرف تمہارے دل کا میلان ہوا اور وہ اتفاقات نہ کرے تو یقیناً سارا لطف خاک میں مل جائے گا۔

یہ سن کر ایک تیرا شخص بول اٹھا۔ حقیقت میں اس قسم کے بعض فقصانات وہاں انسان کو نظر آ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو میں نے شیخ کے سامنے بھی پیش کیا تھا۔ انہوں نے بہت آسانی سے میرا اطمینان کر دیا۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے کہا تھا اور گویا اس وقت بھی میرے کان میں کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے ماڈی پیکر کے ساتھ ہزار ہا کشافتیں اور دنایتیں لے کے تو اس عالمِ نور میں جاتے ہو اور پھر امید کرتے ہو کہ سر و شہستان کو اسی پاک و مجر و حیثیت سے دیکھو جس طرح غیر ماڈی آنکھیں دیکھتی ہیں، خود تمہارے فقصان اور تمہارے ماڈی عجز ہیں جو اس حیز نور کو میوب دکھاتے ہیں۔

پہلا: اور وہاں میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ اُس ہور میں ذاتاً فقصان موجود تھا، پھر تم کو اپنی ماڈی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا تھا۔

دوسرا: بے شک۔ یہی سبب ہوگا۔ اول تو اُس ہور میں ذاتاً فقصان موجود تھا، پھر ہمیں اپنی ماڈی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا۔

حسین: (کسی قدر تعلقِ خاطر سے) اور کچھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس ہور کا نام کیا تھا؟
پہلا: ہاں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کا نام زمرد ہے۔ اور میری ہور نے جس کے آغوش کا مزہ زندگی بھرنہ بھولے گا، یہ بھی بتایا کہ اُسے کسی خاکی پیکر سے اس قدر تعلق ہے کہ جنت کی سیر کرنے والوں میں کسی کی طرف اتفاقات نہیں کرتی۔

دوسرے دن حسین یہاں سے رخصت ہو کر آگے روانہ ہوا اور دو ہی چار روز میں قلعہ الموت کے

پھاٹک پر کھڑا تھا۔

مردُو دِ آزی

قلعہ الموت کے پھاٹک پر حسین روا کا گیا، اور چونکہ اندر داخل ہونے کا اجازت نامہ نہیں پیش کر سکا لہذا وہی خط جو شیخ علی وجودی نے لکھ دیا تھا۔ اس سے لے کے قلعہ دار کے پاس بھیجا گیا۔ پھر رُکن الدین خورشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، جو ان دونوں تمام باطنین کا امام اور علی ذا کرہ اسلام کا پوتا تھا۔ خورشاہ کا ہنور اٹھتا شباب تھا۔ مگر چونکہ ان لوگوں کی عقیدت میں امام پیدا ہوتے ہی امام ہوتا ہے لہذا ان کے قدس وجہت میں نو عمری سے کوئی فرق نہیں ہونے پاتا۔ ان کے نزد یک اگر رتبہ امامت حاصل ہو تو ایک چھ برس کا بچہ اور سانچھ برس کا بوڑھا دونوں یکساں معصوم ہیں اور دونوں کے احکام یکساں طریقے سے واجب التعمیل ہیں۔ یہ سلطنت اور یہ مذہب دونوں حسن بن صباح کی بنی نظیر کوششوں سے قائم ہوئے تھے جس کا بُو بُریڈھ سو برس گزر چکے تھے۔ اور باوجود یکہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہو گئے مگر اس خاندان کا وہی دور دورہ رہا۔ بعض دلیر اور اولو العزم حملہ آوروں نے دو ایک مرتبہ یہاں سیاسی قوت کو ضرر پہنچایا مگر بعض اثرات پہلے سے زیادہ ترقی پر ہیں اور امروت کا قلعہ اسی طرح مامون و محفوظ چا آتا ہے جس پر مخالفت کے ساتھ کوئی پرندہ بھی پہنچیں مار سکتا۔

مذہبی مقتدائی کا تاج تو یہاں کے تاجداروں کے سر پر ابتداء ہی سے تھا مگر علی ذا کرہ اسلام کے عہد سے یہ لوگ اپنے آپ کو امام اور یادگارِ خاندان بنی فاطمہ بھی کہنے لگے۔ اس لیے کہ ذا کرہ اسلام نے دعویٰ کیا کہ جب میں بچہ تھا تو نزارین مستنصر فاطمی کے پوتے سے مخفی طور پر بدل لیا گیا۔ اس وقت ان لوگوں نے علائیہ امامت کا دعویٰ کر دیا اور اب اپنے آپ کو نورِ محض اور لاہوت و ناؤت کا

برزخ ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ بادشاہ یا امام کے احکام بے عذر، بے چحت، آنکھیں بند کر کے، بجا لاتے ہیں اور جن کے خبر سے سارا زمانہ کانپ رہا ہے، فدائی کھلاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہے کہ مقتدی اور فرمائروں کے حکم پر جان دینا اور خود کشی ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ انھی فدائیوں کی وجہ سے جور عرب و ادب رُکن الدین خورشاد کے دربار میں ہے، شاید اس عہد کے کسی بادشاہ کے دربار میں نہ نظر آتا ہوگا۔ یہاں کسی کی اتنی بھی مجال نہیں کہ بادشاہ کے سامنے بے ادبی و مخالفت کا خیال بھی دل میں لاسکے۔

شیخ علی وجودی کا خط دیکھتے ہی حسین کو بازیابی کی اجازت دی گئی۔ حسین نے سامنے جا کے جیسے ہی فرمائے الٹوٹ کی صورت دیکھی، دوڑ کے قدموں پر گر پڑا اور چلا یا:

”ہذا امامی! ہذا امامی“ رُکن الدین اس کے اٹھانے کے لیے جھکنے ہی کو تھا کہ اہل دربار میں سے بعض ممتاز لوگوں نے اسے اٹھا کے کھڑا کیا اور کہا ”بے شک یہی امام زمانہ ہیں اور نورِ محض ہیں مگر ادب و صبر سے کام لواور جو انجام ہو، پیش کرو۔“

خورشاد: اے نوجوان آملی! تجھ میں کیا بات ہے کہ وادیِ ایمن تیری انتہا سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ تیرے علم و فضل کے بھی مداح ہیں اور تیری بہادری و جاں بازی کے بھی۔

حسین: (ادب سے زمین چوم کر) صرف اسی سبب سے کہ میں نے اُن کی خدمت گزاری میں کوئی وقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اور کبھی اس بحرِ حقیقت کے حکم سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کی۔

خورشاد: اور اب شیخ نے تجھے کس غرض سے یہاں بھیجا ہے؟

حسین: یا امام قائم قیامت! میں فردوس کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

خورشاد: (غور کر کے) ابھی تک تو اُن لمعاتِ انوارِ لمیں سے یہی آواز آ رہی ہے کہ سن

بُراني۔

حسین: یا امامِ قائم قیامت کی توجہ نے شفاعت کی تو ممکن نہیں کہ میری آرزو برنا آئے۔

خورشاد: اے بُو الہوس پیکر خا کی! ابھی اس کے متعلق تجھے کسی قسم کی امید نہیں دلائی جاسکتی۔

یہ کہہ کے خورشاد ایک اور شخص کی طرف متوجہ ہونے کو تھا کہ حسین نے آبدیدہ ہو کے اور پُر دردار ماہی کی آواز میں کہا ”تو اس ادنیٰ جاں شار بارگاہ امامت کو اجازت ملے کہ اس آستانے پر ٹھہر کے اس وقت کا انتظار کرے جب کہ یہ آرزو برآئے گی۔ آیندہ عیدِ قائم قیامت کے موقع پروادی ایکن بھی یہاں تشریف لا نہیں گے اور کیا عجب کہ اس دن جب کہ قائم قیامت اور امام یک جا ہوں گے اور مخلوق کو خالق سے یا پرتو کوئور سے زیادہ قدر بت ہوگی، میری دُعا قبول ہو جائے۔

خورشاد: اچھا، ٹھہر و مگر یہ خیال رہے کہ یہاں کے امتحان زیادہ سخت ہیں۔

حسین: میں ہر قسم کے امتحان دینے کو تیار ہوں۔

خورشاد نے اس کے بعد دوسرے شخص کی طرف توجہ کی اور پوچھا ”دیدار کب آئے؟“

دیدار: (ہاتھ جوڑ کے) آج ہی صحیح کو۔

خورشاد: اور جس کام کے لیے گئے تھے، وہ پورا ہو گیا؟

دیدار: میرا خجراں بھی خالی گیا ہے؟ اگر چہ مہم دشوار تھی مگر جنت کے شوق میں وہاں پہنچا اور امام کے حکم کو نہایت کامیابی سے پورا کیا۔

خورشاد: ہاں، بیان کرو۔ تم نے چغتاں خان کو کیوں قتل کیا؟

دیدار: یا امامِ قائم قیامت! ترکستان میں اس جاں شار کا نام منقی تھا۔ وہاں کی مختلف صحبتوں میں شریک ہو کے فدوی نے ایسی ہر دل عزیزی پیدا کی کہ منقو خان چغتاں خان کے بہادر بیٹے کے

دل میں مجھ سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے مجھے بُلوا کے اپنے گھر میں رکھا اور کئی مہینے تک یہی حالت رہی کہ جب تک میں نہ ہوتا کسی بات میں اُس کا دل ہی نہ لگتا۔ اس نے مجھے اپنے باپ سے ملا یا۔ چغتائی خان بھی میری باتوں کا دیوانہ تھا۔ چند روز تک باپ بیٹوں کا میرے سوا کوئی انہیں جلیس نہ تھا۔ چغتائی خان اپنی ذات سے ایسا زبردست اور قوی ہیکل واقع ہوا تھا کہ اس پر حملہ کر کے کامیاب ہونا مجھے نہایت دشوار نظر آیا اور اس وجہ سے مجھے کئی مرتبہ موقع ملنے پر بھی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک روز رات کو جب ہلاکو خان کسی بڑی مہم سے آیا تھا اور منقو خان اس سے ملنے گیا تھا، چغتائی خان مجھے تہائی میں سوتا ہوا مل گیا۔ اس سے زیادہ مناسب موقع ملنے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے چپکے ہی چپکے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں ایک رسی سے باندھ دیے اور پھر اس پر چڑھ کے اس کا کام تمام کیا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔ مگر مجھے حکم ہوا تھا کہ ان لوگوں کو بتا بھی دوں کہ چغتائی خان قتل کر دیا گیا۔ اس غرض کے لیے ان تمام حالات کو ایک خط میں لکھ کے میں نے پہلے ہی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب اُسی خط کو لے کے ہلاکو خان کی فرودگاہ کی طرف چلا۔ خوش نصیبی سے چغتائی خان کی پیشی راستے میں مل گئی جو ہلاکو خان سے مل کے اپنے گھر کو آ رہی تھی۔ رات کے اندر ہیرے میں میں نے وہ خط اُس کے ہاتھ میں چپکے سے رکھ دیا اور بھاگ کے قریب کے جنگل میں چھپ رہا۔ دوسرے دن صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ قراقرم ماتم کده بننا ہوا ہے اور ہر شخص کو میری جستجو ہے۔ بعدہ، موقع پا کے میں نے ایک غار میں پناہ لی اور پورے آٹھ دن تک اسی میں چھپا بیٹھا رہا۔ نویں دن جب میدان خالی نظر آیا تو اس غار سے نکل کے ادھر کو رو انہ ہوا۔ تین مہینے بعد اب آستان بوسی کو عززت حاصل کر رہا ہوں۔

خورشاد: بے شک، دیدار۔ تم نے بڑا کام کیا اور مستحق ہو کہ تمھیں آج ہی جنت کی سیر کرائی

جائے۔

یہ سُنْتَهِ ہی دیدار خورشاد کے قدموں میں گر پڑا۔ خورشاد نے خود اپنے ہاتھ سے اُسے اٹھایا اور ساتھ ہی لے جانے کو تھا کہ حسین نے از خود فُلّی کے جوش کے ساتھ کہا ”اے بے رحم بادشاہ! میں سب سے زیادہ جنت میں جانے کا آرزو مند ہوں اگر یوں نہیں تو میرا امتحان لیا جائے۔ بتایا جائے کہ میں بھی کسی کو قتل کروں۔ آہ! زمر دکے فراق میں صبر نہیں ہو سکتا۔

خورشاد: ابھی نہ تھا را امتحان لیا جا سکتا ہے اور نہ تم کو باغ فردوس میں جانے کا کوئی استحقاق ہے۔
حسین: (جو شو و خروش سے) مجھ سے زیادہ مستحق کوئی نہیں۔ میں نے امام نجم الدین غیثا پوری کے زندگی کا چدائغ گل کیا ہے۔ امام نصر بن احمد کو خون میں ہاتھ رنگ چکا ہوں۔ اب اس کے بعد بھی کوئی مجھ سے زیادہ مستحق ہو سکتا ہے؟ میں صرف اپنی بے صبری ہی کی وجہ سے مستحق نہیں بلکہ ایک مینوں شین ہو رہی میرے لیے حیران و پریشان ہے۔

یہ گستاخانہ جملہ سُنْتَهِ ہی سب چونک پڑے۔ بعض حسین پر حملہ کرنے کو جھپٹے۔ قریب تھا کہ اردوگرد کے قوی ہیکل فدائی اس کی بوٹیاں اڑا دیں کہ خورشاد نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روکا اور نہایت ہی متاثر کے ساتھ حسین کا حال دیکھ کے بولا ”اس گستاخی اور بد تمیزی کی سزا میں تم سے کہا جاتا ہے کہ فوراً قلعے سے باہر نکل جاؤ۔ تم اس لاٹنی نہیں کہ فردوس بریں کی پاک زمین تھا رے قدم سے ناپاک کی جائے۔ تھا ری سزا قتل تھی۔ چند ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے میں تھا رے قتل کو مُناسِب نہیں خیال کرتا۔ مگر اب یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس قلعے میں ایک گھڑی بھر کے لیے بھی ٹھہر نے پاؤ۔“

حسین کو فوراً اپنی گستاخی کا خیال آیا۔ ایک بے اختیاری کی شان سے وہ زمین پر گر پڑا اور عاجزی

کے لبھے میں رورو کے کہنے لگا ”یا امام قائم قیامت! میری خطا معاف ہو۔ میں جوشِ عشق میں بے اختیار و بے خود ہو گیا تھا“، لیکن بالکل شنوائی نہ ہوئی اور خورشاد دیدار کو لیے ہوئے اپنے محل میں چاگیا۔ اس کے جاتے ہی لوگوں نے حسین کو زبردستی دھکے دے کے قلعے سے نکال دیا۔ اُس نے ہزار منت سماجت کی مگرایک پیش نہ کی گئی۔ بلکہ بعض لوگوں نے کہا کہ تم بڑے خوش نصیب تھے کہ صرف خارج البلد کیے جاتے ہو ورنہ یہاں گستاخی کی سزا قتل ہے۔

حسین: پھر اب میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں؟

لوگ: ہم نہیں جانتے۔ تمھیں اختیار ہے۔

حسین کی مايوسی کی اس وقت کوئی انتہانہ تھی۔ صرف یہی نہ تھا کہ وہ زمرد کے وصال سے مايوس ہو گیا ہو بلکہ اپنے آپ کو رحمت باری اور نجات سرمدی سے بھی دور سمجھتا تھا۔ اس کے عقیدے میں تھا کہ جب میں اس درگاہ سے مردود ہو گیا تو پھر کہیں ٹھکانا نہیں ملے گا۔ غرض الگوتو کے باہر پہاڑوں میں روتا ہوا اور چٹانوں سے سر ٹکراتا تھا۔ دل میں آئی کہ اپنے شیخ علی وجودی کے پاس جا کے ان سے معافی کی درخواست کرے مگر خیال کیا اس بارگاہِ امامت سے نکالے جانے کے بعد وہ بھی اپنے ہاں پناہ نہ دیں گے۔ خیال ہر طرف لے جاتا اور ہر طرف سے مايوسی کے آثار نظر آتے۔ آخر سے زمرد کی نصیحت یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی کوہ البرز کی گھانی اور زمرد کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ یکاً یک آپ ہی کہہ اٹھا تو مجھے وہاں چلنا چاہیے۔ پس اب میرے لیے وہاں کے سوا اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔“ مگر اس کے ساتھی دل میں خیال گزرا کہ اب تو وہاں بھی مقدوری کی امید نہیں۔ جب اس نورستان اور سر و شہستان سے میرے تعلقات مطلقاً قطع کر دیے گئے تو وہ بھی مجھ سے ناخوش ہو گی۔ اور اگر بالفرض خوش بھی ہوا وہ قدیم محبت اس کے دل میں باقی بھی ہو

تو یہ کیوں کر ممکن ہو گا کہ امام اور مرشد کے خلاف وہ مجھے کسی قسم کی مدد سے سکے۔ اب یہ بھی امید نظر نہیں آتی کہ پہلے کی طرح اور وعدے کے مطابق وہ مجھے کامیابی کا کوئی راستہ بتا سکے۔ یہ خیال کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ بار بار دل میں آتی تھی کہ انھی پہاڑوں سے ٹکرا کے خود کشی کرے مگر اس میں اور زیادہ ما یو ٹی کا یقین تھا۔ آخر اس نے دل میں یہی فیصلہ کیا چلو، زمرد ہی کی قبر پر چل کے بیٹھوں۔ اگر دل کی انجمن زیادہ بڑھے گی تو اس حور و ش کی قبر کو سینے سے لگا لوں گا۔

یہ فیصلہ کر کے وہ روتا اور سر دھنٹتا ہوا پہلے قزوین گیا۔ پھر قزوین سے نکل کر کوہ البرز کی اتنی پرانی گھائی پر پہنچا اور وہیں مقیم ہو گیا۔ اتنے انقلاب، اتنی سرگردانی کے بعد اب پھر وہ معشوقہ دلبر کی ٹربت کا مجاہر ہے۔ اسی طرح شب و روز عبادت و فاتحہ خوانی میں مصروف رہتا ہے۔ قبر کے پاس بیٹھ بیٹھ کے گھنٹوں زمرد کے خیال سے با تیس کرتا ہے اور بار بار رورو کے کہتا ہے ”اے مینو نشین ناز نین! خدا کے لیے اپنی قبر کی طرف توجہ کر اور دیکھ کہ میں کیسا حیران و پریشان ہوں۔ آہ! تیرے عشق اور تیرے فراق کی بے صبری نے دونوں جہان سے کھو دیا۔ نہ اس دنیا ہی کے کام کا رہا اور نہ اُس عالم کے کام کا۔ او معشوقہ اور بارگاہِ علم یزل کی ناز نین! میرے حالی زار پر توجہ کر۔ اس درگاہ میں میری شفاعت کر اور اپنی محبت کا صدقہ، مجھے اپنے وصل سے ما یوس نہ رکھ۔“

یہی خیالات تھے جن کو وہ قبر کے سامنے ظاہر کرتا اور یہی دعا تھی جو ہر وقت اُس کے لب پر تھی۔ آخر ایک دن اُس کی امید برآئی۔ صبح سوریے آنکھ کھول کر دیکھا تو قبر پر زمرد کا خط رکھا ہوا تھا۔ ایک نہیں، بلکہ دو خط، جن میں سے ایک لفافے میں بند تھا اور دوسرا کھلا ہوا۔ حسین نے دونوں خطوں کو اٹھا کے چو ما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر گھلے خط کو پڑھنے لگا، جس میں مضمون حسب ذیل

حسین تو نے بڑی غلطی کی۔ امام قائم قیامت کی خدمت میں اور گستاخی! غنیمت ہے کہ تو فوج گیا۔ افسوس کہ میں اپنے دل کو تیری طرف سے نہیں پھیر سکتی۔ چند روز کے لیے یہاں آ کر تو مجھے اور بے تاب کر گیا۔ اور اسی بے تابی کا نتیجہ ہے جو میں تجھے خط لکھ رہی ہوں۔ افسوس! میں وہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئی جو مجھے کرنا نہ چاہیے تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ جو بات ہونے والی تھی کیوں کر رکتی۔ خیر، اب تو مستعدی سے میری تدبیر پر کار بند ہو۔ مگر یہ سمجھ لے کہ یہ بہت ہی نازک کام ہے، جسے ضبط و تحمل سے انجام دینا چاہیے۔ اگر تو نے ذرا بھی میرے مشورے کے خلاف عمل کیا تو تجھے ضرر پہنچے گا اور پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ یہ آخری اور سخت تدبیر ہے اور اس کے عمل کے لانے پر میں اس وقت مجبور ہوئی ہوں جب یہ یقین ہو گیا کہ تیرے لیے اب اُمید اور آرزو کے سب دروازے بند ہو گئے۔ یہ دوسرا خط تجھے اس خط جو کے ساتھ ملے گا اور بند ہے، اسی طرح بند رکھ۔ اس کو لے کے مشرق کی طرف روانہ ہو اور سیدھا شہر قراقروم میں جو کاشغر کے قریب ہے، پہنچ۔ وہاں معمولوں کی شاہی خاندان میں ایک ملکہ ہے، بلغان خاتون، اُس سے تہائی میں ملنے کی کوشش کرو اور میرا یہ خط اُسے دے دے۔ اس امر کی کوشش نہ کر کے اس میں کیا لکھا ہے اور نہ اس امر کو بلغان خاتون سے پوچھنا۔ وہ تجھ سے جو سوال کرے، بس اس کا صحیح جواب دے دے اور ملکہ بلغان خاتون جس امر کا ارادہ کرے، اس میں اس کی پیروی کر۔ اگر وہ تیرے ساتھ آتا چاہے تو اُسے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہوں، ان سب کو میری قبر پلا کر کے کھڑا کر دے۔ بلغان خاتون غالباً تجھ سے اخلاق سے پیش آئے گی اور یقین ہے کہ اپنی قوم کے ایک لشکر کے ساتھ ادھر آنے کا ارادہ کرے گی۔ تو خوشی سے اس کی رہبری کرنا اور منتظر رہ کہ پردا غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

تیری دلدادہ زمرد۔

حسین یہ خط پڑھتے ہی فوراً قرقرم کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں بار بار اُس کے دل میں آتا تھا کہ مجھے وہاں بھیجنے سے زمرد کی کیا غرض ہے؟ مگر اُس کو وہ خود ہی مٹاتا اور کہتا کہ ان معاملات کے تجھس سے زمرد نے منع کیا ہے، تاہم ایک چیز کی اسے بڑی فکر تھی۔ وہ یہ کہ زمرد نے ملکہ کو سوالوں کا سچ سچ جواب دینے کی ہدایت کی ہے اور میں ایسے کام کر چکا ہوں جن کے ظاہر کرنے میں ہر جگہ جان کا اندر یشہ ہے۔ کیا یہ بتاؤں کہ میں نے امام نجم الدین نیشاپوری کے بے خطاو قصور قتل کیا؟ یا امام نصر بن احمد کی نماز پڑھنے میں جان لی؟ اور سب باقیں درکنار وہاں تو شاید اگر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجھے فرقہ باطنیہ سے کوئی تعلق ہے تو واجب القتل قرار دیا جاؤں گا۔ کئی مہینے جو منازل سفر طے کرنے میں صرف ہوئے، انھی خیالات اور اسی قسم کے ترددات میں گزرے۔ آخر وہ چلتے چلتے ترکستان کی حدود میں داخل ہو گیا اور چند روز بعد خاص شہر قرقرم میں وارد ہوا جو تاتاریوں کا پا یہ تخت تھا۔ قرقرم میں پہنچ کے بھی کئی مہینے گزر گئے مگر شہزادی بلغان خاتون تک رسائی نہ ہوئی جس کے حسن و جمال کے قصے سارے شہر میں مشہور تھے اور کہا جاتا تھا کہ اپنے باپ کے مارے جانے کے صدمے سے تمام لذائِ دُنیوی سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ آبادی سے باہر اس کا ایک باغ تھا جس میں ایک وسیع اور دلچسپ شکارگاہ بنی ہوئی تھی۔ مگر باپ کے غم نے ایسا پھر مُردہ کر دیا تھا کہ اُس نے اب اس باغ میں آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن حسین وسطِ شہر میں کھڑا تھا کہ ناگہاں غل ہوا ”شہزادی بلغان خاتون آئی ہے۔“ وہ سڑک کے کنارے ٹھہر گیا اور زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا تھا کہ ملکہ کئی سہیلیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار آئی اور نکل گئی حسین شاید جرأت کر کے اور جان پر کھیل کے ساتھ میں خط دے دیتا مگر زمرد نے تاکید کی تھی کہ تنهائی میں دینا۔ ما یوسی کی

صورت بنائے خاموشی کھڑا رہ گیا اور جب شہزادی نکل گئی تو دل میں کہنے لگا ”یہ تو مشکل نظر آتا ہے کہ اس ناز آفرین ملکہ کی خلوت گاتک رسائی ہو۔“

چند روز اور گزر گئے۔ اب سُنا گیا کہ شہزادی نے مددت کے بعد باغ اور شکارگاہ میں جانے کا ارادہ کیا ہے۔ حسین کو امید پیدا ہوئی کہ غالباً وہاں موقع مل جائے گا۔ اسی خیال سے پہلے ہی جا کے شکارگاہ میں پھٹپ رہا۔ وہاں بھی ملکہ باغان خاتون آئی اور چپکے سے ہی چلی گئی۔ حسین کو موقع ملنا تھا نہ ملا۔ کئی دفعہ وہ ملکہ سے دوچار ہوا مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی سہیلی ضرور موجود ہوتی تھی۔

جب حسین کو زیادہ مایوسی ہوئی تو آخر تدبیر یہ کی کہ نوکری کا امیدوار بن کے ملکہ کی ڈیورٹھی پر پہنچا اور ملازمت کی درخواست کی۔ اتنے دن قراقرم میں رہ کے اس نے چندایے دوست بھی پیدا کر لیے تھے جنھوں نے اس کی سفارش کی اور اسے بُشواری ملکہ کو داروغہِ اصطبل ہونے کی عزت حاصل ہو گئی۔ اس نوکری کے بعد بھی دو مہینے تک اسے تنہائی میں ملنے کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک مرتبہ صح سویرے جب کے ملکہ اپنے بستر ناز سے اٹھ کر غسل خانے میں جا رہی تھی اور بالکل اکیلی تھی، وہ سامنے آ گیا اور جھک کر سلام کیا۔ باغان خاتون حسین کو غیر معمولی طور پر سدراہ دیکھ کے ٹھہر گئی اور پوچھا ”کیوں؟ کیا بات ہے؟“

حسین: (زمین چوم کے) شہزادی کی خدمت میں ایک خط پہنچانا ہے، جس کو لیے ہوئے چھ مہینے سے قراقرم میں پھر رہا ہوں اور صرف اس وجہ سے کہ بغیر تنہائی کے مجھے اس خط کے پیش کرنے کی اجازت نہ تھی، اتنی تائیر ہوئی۔ اسی غرض کے لیے مجبوراً میں نے شہزادی کی ملازمت اختیار کر لی۔ بڑی بڑی نامرادیوں کے بعد خوش نصیبی سے اس خط کے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔“ یہ کہہ کہ اس نے زمر دکا خط نکال کر شہزادی کی طرف بڑھایا۔

شہزادی بلغان خاتون تاتاری عورتوں میں ہی نہیں، تاتاری رو سا کے بھی خلاف ایک نہایت ہی شایستہ اور تعلیم یا فتہ ملکہ تھی۔ وہ فارسی زبان میں بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ اس قدر نہیں بلکہ شعرائے فارس کے کلام کی اچھی طرح داد دے سکتی تھی، اور مشکل اور بلیغ فارسی کو بوجہ احسن سمجھ لیتی تھی۔ خط کو ہاتھ میں لیتے ہی اس نے غور سے دیکھا، پھر لفافے کو سادہ پا کے تُجہ سے حسین کی صورت دیکھی اور پوچھا ”یہ خط کس نے بھیجا ہے؟“

حسین: شہزادی کو پڑھنے کے بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ خط کسی انسان کا نہیں بلکہ ایک حور کی طرف سے ہے جس کا نیشن اُس سر و شہستان اعلیٰ اور حیز نور میں ہے۔

بلغان خاتون نے یہ جواب سُن کے اور حیرت زدہ ہو کے حسین کی صورت دیکھی اور پوچھا ”اگر فردوسِ بریں کی کسی حور کا خط ہے تو تم کو کیوں کر ملا؟ اور تم سے اس کا کیا تعلق؟“

حسین: بس اتنا ہی تعلق ہے کہ اُس کی یاد میں سر دھستا ہوں اور کبھی کبھی وہ کوئی خط کسی روحانی ذریعے سے میرے پاس پہنچا دیتی ہے۔

تاتاری شہزادی یہ جواب سُن کے اور متھیر ہوئی اور دریتک حسین کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دل میں سوچ کر بولی ”اچھا، اب اس وقت تم جاؤ۔ اس خط کو اطمینان سے پڑھ کر میں تم کو بلاؤں گی۔“

حسین: (سینے پر ادب سے ہاتھ رکھ کے) بہتر مگر اتنا خیال رہے کہ اس بارے میں جو کچھ دریافت فرمانا ہو، شہزادی اسی طرح تہائی میں بُلا کے دریافت فرمائیں۔ میں اپنے راز کو کسی اور کے سامنے صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

بلغان خاتون: میں اکیلی ہی ملوں گی۔

یہ خط اور حسین کا بیان معمولی چیزیں نہ تھیں۔ شہزادی بالغان خاتون نہان بھی بھول گئی اور حسین کے واپس جاتے ہی پھر اپنی خواب گاہ کی طرف پلٹ گئی۔ تنہا بیٹھ کے خط کو کھولا اور نہایت توجہ اور مستعدی سے پڑھنے لگی۔

مضمون حسب ذیل تھا:

”اوغزر دہ اور نیک دل شہزادی! تو اپنے باپ کے غم میں بتلا ہے جو باطنیں کے فدائی دیدار کے ہاتھوں سے نہایت دغا بازی کے ساتھ قتل ہوا۔ مجھے تیرے رنج والم سے ہمدردی ہے۔ اسی لیے اپنے منصب کے خلاف تجھے خبر دیتی ہوں کہ دیدار یہاں قلعہ الگوت میں بیٹھا جنت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اگر اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتی ہے، اگر دنیا کے پردے سے ایک بہت بڑا فتنہ دور کرنا چاہتی ہے تو اسی حسین کے ساتھ جو میرا خط لایا ہے اور جو جنت کی زیارت کے شوق میں عقل و ہوش بلکہ دین و ایمان کھو چکا ہے، کوہ اکبر زکی وادی میں میری ٹربت پر آ کے پھر کو اُٹ۔ اس کے نیچے تو میرا دوسرا خط پائے گی جو تیری رہبری کرے گا اور تو اپنے باپ کے انتقام کے ساتھ ایک بڑے طلسِ موت کو توڑ کے دنیا کا سب سے بڑا راز کھولے گی۔ اُس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا اور ملائِ اعلیٰ میں کتنا فرق ہے۔ حسین سے تو اس کے حالات پوچھ سکتی ہے جس سے تجھے معلوم ہو گا کہ اس کے دل پر فردوسِ بریں کا کتنا اثر ہے۔ جہاں میں ہوں یہی جنت میں تجھے بے مثت دکھاؤں گی اور تیرا مجرم تیرے ہاتھ میں ہو گا۔ لہذا آ اور جلدی آ۔ مگر خیال رہے کہ ۲۷ رمضان کی صبح کو میری ٹربت پر موجود ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کافی تعداد میں ایک تاتاری لشکر تیرے قریب ہی موجود رہے لیکن میری قبر پر تجھے اپنے ساتھ میں چار آدمیوں سے زیادہ کونہ لانا چاہیے۔ مینو نشین زمرد۔“

بلغان خاتون کے حق میں یہ خط کسی جادو یا تسلیم کے حکم سے کم اثر نہ رکھتا تھا، جس کو پڑھتے پڑھتے کبھی وہ انتہا سے زیادہ غصب ناک ہو جاتی اور کبھی خاص خیال سے اس کے دل کو یک گونہ تسکین ہو جاتی۔ مگر حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے خط کو اول سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا اور کچھ سوچنے لگی۔ آخر بہت دیر کے لیے تردد و امتناع کے بعد اس نے حسین کو اپنے سامنے بُلا�ا اور

پوچھنے لگی ”تم جانتے ہو اس خط میں کیا لکھا ہے؟“؟

حسین: نہیں۔ مجھے ایک لفظ کی بھی خبر نہیں۔

یہ جواب پاکر بلغان خاتون نے تجسس کی نگاہ سے حسین کو گھور کے دیکھا اور پوچھا ”تم مذاہب باطنیہ کے پابند ہو؟“؟

حسین: (ڈر کے) جی ہاں۔

بلغان خاتون: تم نے جنت کی سیر کی ہے؟

حسین: ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوں ہے۔

بلغان خاتون: اچھا، تمہاری یہ ہوں پوری ہو جائے گی، مگر یہ بتاؤ، تمہارے شمارفدا یوں میں ہے؟
حسین: البتہ۔

یہ جوب سُن کر بلغان خاتون پھر حسین کو گھور کے دیکھا اور پوچھا ”تم نے کتنے لوگوں کی جان لی ہے؟“؟

حسین: صرف دو شخصوں کی۔ مگر بڑے بڑے شخص، جن کے قتل کرنے کا مجھے بھی افسوس ہے۔

بلغان خاتون: اُن پر خبر چلاتے وقت تمہیں ترس نہ آیا؟

حسین: آیا تھا مگر مرشد کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔

بلغان خاتون: (تعجب سے) مُرِشد کے حکم سے اتنے بڑے ارتکاب کر لینے میں تمھیں اپنے نیک و بد کا خیال نہیں آیا؟

حسین: نیک و بد ہمیں نظر ہی کب آتا ہے۔ ہم ہر چیز کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور شیخ کی نگاہیں باطن پر، یا یوں کہنا چاہیے کہ اصلی حقیقت پر پڑتی ہیں۔

بلغان خاتون: اگر مُرِشد گرنے کو کہے تو گر پڑو گے؟

حسین: بلا تأمل! یہی ہمارا عقیدہ اور پہلی ریاضت ہے۔ مُرِشد جس خوبی کو دیکھ کے حکم دیتا ہے، اُس کے سامنے اس بُرائی یا مضرت کی کوئی ہستی ہی نہیں۔

بلغان خاتون: زمرد کی تم سے کیوں کرمفارقت ہوئی؟

حسین: میں منع کرتا رہا، اُس نے نہ مانا اور کوہ الہر ز کی اس گھائی میں چلی گئی جہاں کبھی کبھی پر یوں کا گزر ہوتا ہے۔ ہمارے جاتے ہی پریاں بھی آ پہنچیں۔ انہوں نے آتے ہی اُسے مار ڈالا اور اُس کی وہاں قبر بنادی جس پر مددتوں میں آہ وزاری کرتا رہا۔ شہادت نے زمرد کو فردوس بریں میں پہنچا دیا اور میں قبر پر پڑا موت کا منتظر تھا کہ زمرد نے فردوس بریں سے خطبیح کے مجھے فرقہ ناجیہ باطنیہ میں داخل ہونے کی ہدایت کی اور اپنے پاس پہنچنے کا طریقہ بتایا، اُس کی ہدایتوں کے مطابق عمل کر کے میں ایک بار اُس کے دیدار سے شرف یا ب ہو چکا ہوں۔ مگر افسوس پھر ملنے کی امید نہیں۔ اب دوبارہ کوشش اس کی زیارت کے لیے آپ کے ذریعے سے شروع ہوئی ہے مگر چونکہ مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں۔ لہذا آپ کے سامنے میں اپنی کوئی آرزو پیش نہیں کر سکتا۔

بلغان خاتون کو حسین کی اس سادہ مزاجی پر حیرت ہوئی۔ وہ کسی قدر مسکرائی اور کہا:

”بے شک میں اپنی آرزو میں با مراد ہوں گی اور تمہاری تمثیل براۓ گی۔ لیکن مجھے بھی اُس مقام

تک پہنچا و جہاں زمّرد کی قبر ہے اور جس جگہ تم کہتے ہو کہ وہاں پر یوں کا نشیمن ہے۔“

حسین: اس امر کا تو مجھے حکم ہو چکا ہے۔ شہزادی جب تشریف لیں چلیں، یہ غلام ہمار کاب ہو گا۔

بلغان خاتون: حسین اگر میں کسی قتل کرنے کا کہوں تو تم اسے قتل کر ڈالو گے؟

حسین: بے شک، بشرطیکہ اسے قتل کرنے میں کچھ مضائقہ نہ ہو۔

بلغان خاتون: یہ قید تم مرشد سے بھی لگاتے ہو؟

حسین: نہیں۔ مرشد کے تعلقات مرید کے ساتھ اور قسم کے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں مرید کو ایک بے جان آلے کی طرح رہنا چاہیے۔

بلغان خاتون: خیر اب تو میں سفر کا سامان کرتی ہوں۔ تم بھی تیار رہو۔

یہ کہہ کے شہزادی نے حسین کو رخصت کیا اور خود حمام میں گئی۔ مگر اُس کی حیرت کسی طرح کم ہونے کو نہ آتی تھی۔ لوگ اُس کے مزاج میں کوئی غیر معمولی تغیر پاتے تھے جس کے متعلق ہر شخص سوال کرتا مگر وہ خاموش رہتا۔

دوسرے دن اُس نے علی الصباح ایک ساٹھ فی سوار کو خط دیکر کسی طرف روانہ کیا اور خود بھی روانگی کا سامان کرنے لگی۔ مگر اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنے اُن غم اور شہنشاہ تُرکستان منقو خان سے اجازت حاصل کرے جس کے لیے وہ ایک تردد میں تھی۔

بلغان خاتون کا سفر

جس روز حسین نے اپنی مینوں شین معشو قہ زمر دکا خط بلغان خاتون کو پہنچایا ہے، اُس کے ایک ہفتے کے بعد صبح کے وقت تاتاری شہزادی اپنے بھائی منقو خان کے پاس گئی۔ منقو خان کے دربار میں اُس وقت خاندانِ تاتاری کے کئی معزز زر و ساموں جو دتھے جن کے سامنے وہ کہتے ہوئے جھجکلی اور دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ اُس کو پچپ دیکھ کے منقو خان نے کہا ”یہ غیر معمولی سکوت کیسا؟“ ایک درباری: شہزادی اپنے والد کے غم کو آج تک نہیں بھولیں۔

منقو خان: ہاں، بلغان! اب تو اس غم کو چھوڑ دو۔ اتنے دنوں تک غم والم میں بنتا رہنا ہماری قومی شجاعت کے خلاف ہے۔

بلغان خاتون: آہ بھائی! یہ غم بھول سکتا ہے؟ (تحوڑے سکوت کے بعد) خیر۔ اب با تیں تو ہوتی رہیں گی، اس وقت میں ایک ضروری کام کو آئی ہوں۔

منقو خان: وہ کیا؟

بلغان خاتون: بھائی! آپ نے تو بہت سی مہمیں سر کیں مگر اب ارادہ ہے کی ایک مہم کو میں خاص اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے انجام دوں۔

اس جملے کو سنتے ہی سب لوگ حیرت میں آگئے۔ منقو خان نے اُسے گھور کے دیکھا اور پوچھا ”بہن! خیر تو ہے؟ کیسی مہم؟ کیا میرے اسلحہ نے جواب دے دیا ہے؟ فقط تمہارے کہہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس ملک یا جس قوم کو کہو، میرے جانے کی بھی ضرورت نہیں، ہمارے بہادر سپاہی جائیں گے اور ایک آن میں تہ و بالا کر دیں گے۔“

بلغان خاتون: یہ صحیح ہے، مگر میں چاہتی ہوں کہ اس کام کو خاص اپنے ہاتھ سے انجام دوں۔

منقوخان: آخر کون سا کام ہے، اور کس پروفوج کشی کا ارادہ ہے؟

اسکے جواب میں بلغان خاتون نے زمر دکا خط اُسکے سامنے رکھ دیا اور کہا ”پہلے اسے پڑھ لیجیے، پھر پوچھیے گا۔“ منقوخان نے خط کو اول سے آخر تک پڑھا لیکن ختم کرنے سے پہلے ہی اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اُس نے غصب آلو ڈچشم اور زخم شدہ ہونٹوں سے خط کو تمام کر کے غصے سے پھینک دیا اور کہا ”مطمئن رہو۔ میں کل ہی ہلاکو خان کو لکھتا ہوں۔“

بلغان خاتون: نہیں۔ یہ میرا کام ہے۔

منقوخان: تم جا کے کیا کرو گی! جنگ و پریکار تھمارا کام نہیں۔

بلغان خاتون: اسی خیال کو میں دنیا سے مٹا کے ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ عورتیں بھی ولیٰ ہی بہادر ہیں جیسے مرد۔ اگر موقع دیا جائے تو کسی امر میں مردوں سے کم نہیں رہیں گی۔ اور ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں لڑنے کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔

منقوخان: بے شک ہو گی۔ بغیر اس کے کامیابی ممکن نہیں۔ باقی رہی عورتوں کی شجاعت، میں تسلیم کرتا ہوں کہ عورتوں کی حکومت مردوں سے بڑی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تاجدار اور بڑے بڑے صف شکن جو عالم کے تخت اُلٹ دیتے اور ساری دنیا کے بہادروں کے دست و بازو تھکا دیتے ہیں، ان پر بھی جو حکومت کرتا ہے، وہ عورت ہے۔ مگر عورت کے اسلحہ دوسرے ہیں۔ وہ تیر اور خدگ، شمشیر و نجر سے نہیں لڑتی بلکہ اپنے حریفوں پر تیر

بلغان خاتون نے اس جواب پر شرمندہ ہو کے سر جھکا لیا۔ مگر پچھی نظر وہ میں اس نے پھر متاثر پیدا کی اور کہا ”بھائی! ایسا نہ سمجھیں۔ میں اسی طرح بہادری اور جان بازی سے مقابلہ کروں گی جس

طرح کسی بہاؤ رتا تاری لڑکی کو کرنا چاہیے۔

منقو خان: یہ میں جانتا ہوں مگر جس وقت تک ہم لوگ زندہ موجود ہیں تم سی ناز نین کو میدان جنگ میں قدم رکھنے کی زحمت نہیں دی جاسکتی۔ اور آختمہ حارے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بلغان خاتون: یہ صرف میرا کام ہے اور اپنے فرض سے میں آپ ہی سبک دوش ہونا چاہتی ہوں۔

منقو خان: خیر ایسا ہی شوق ہے تو چلو۔ مگر میں بھی ساتھ چلوں گا۔ یہ مجھ سے گوارا نہیں ہو سکتا کہ خاندانِ مغلیہ کی ایک معزز شہزادی اپنے نامور عزیزوں کے ہوتے ہوئے تین تنہا میدان کار زار میں قدم رکھے۔

بلغان خاتون: مگر بھائی! وہاں کسی لڑائی کی امید نہیں۔ ہمارے چند سپاہی بھی ہوں گے تو کامیاب ہو جائیں گے۔

منقو خان: یہ نہ سمجھو۔ جو لوگ سردار کے ایک ادنیٰ اشارے پر جان دینے کو تیار ہو جائیں، ان سے ڈرنا چاہیے۔

بلغان خاتون: مگر تاتاریوں کا رُغب آج کل دلوں پر اس قدر بیٹھا ہوا ہے کہ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ وہ لوگ بے لڑ کے ہتھیار رکھ دیں گے۔

منقو خان: بے شک ہمارا ایسا ہی رُغب ہے۔ مگر پھر بھی ایک قدیم اور ڈریڈھ سو بر س کے شاہی و مذہبی خاندان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا آسان کام نہیں۔

منقو خان دیر تک اصرار کرتا رہا۔ جب شہزادی بلغان خاتون نے اس کی شرکت کسی طرح گوارانہ کی اور دیکھا کہ بھائی منظور نہیں کرتا تو جھک کے اُس کے کان میں کچھ کہا جسے سُن کے وہ تحوڑی دیر تک غور کرتا رہا اور آخربڑی دیر کی بحث و تکرار کے بعد یہ قرار پایا کہ اُلوٰ العزم و بہاؤ رتا تاری شہزادی

پانچ سو سوار ساتھ لے کے روانہ ہو جائے۔ بلغان خاتون واپسی کے لیے اٹھتے بیٹھ گئی اور خط کو دو باہ بھائی کے سامنے پیش کر کے بولی:

”مگر ذرا دیکھ کے یہ بھی بتا دیجیے کہ مجھے کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے؟ زمرد نے کس تاریخ کو بُلا یا ہے؟“

منقوخان: (خط کو پڑھ کے) رمضان کی ۲۷ تاریخ۔

بلغان خاتون: خدا جانے اس تاریخ کے معین کرنے سے کیا غرض ہے۔ تو پھر مجھے گوچ کر دینا چاہیے۔

منقوخان: اس میں کوئی بات ضرور ہے اور میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ اس گھاتی میں پہنچنے کے بعد تمھیں کیا پیش آئے۔ ممکن ہے کہ اس عورت نے جو اپنے کو حور بتاتی ہے، فریب کیا ہو؟

بلغان خاتون: اس کی تحریر اور اس کی بے تکلفانہ دعوت سے مجھے فریب کی امید نہیں۔ باوجود اس کے محض اسی خیال سے میں نے تھوڑے سے سپاہی ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ اپنی حفاظت کا میں نے پورا بندوبست کر لیا ہے۔ ہاں، تو زمرد نے رمضان کی ۲۷ کو بُلا یا ہے اور آج کون تاریخ ہے؟

منقوخان: جمادی الاول کی ۲۰۔ قریب قریب چار مہینے سے کم کا نہیں۔ اگر جلدی پہنچ گئیں تو راستے میں کسی جگہ ٹھہر جانا مگر جانا ہے تو کل ہی کوچ کر دینا چاہیے۔

اس کے بعد منقوخان کچھ آپ ہی سوچ کر بولا ”ہاں خوب یاد آیا۔ بلغان خاتون، ایک دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ آج سے چوتھے دن ہلا کو خان کی کمک کو چالیس ہزار سپاہیوں کا بڑا بھاری لشکر جانے والا ہے جس کو طوبی خان لے جائے گا۔ اس کے ساتھ تم بھی ہو لینا۔ یہ لوگ بھی اس طرف جائیں

گے جدھر تم جاتی ہو۔ بلکہ انھیں تم سے آگے جانا ہے۔ ہلاکو خان ویلیم کے تخت پر قبضہ کر چکا ہے۔ فی الحال اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس فوج کے پہنچنے کے بعد وہ ارض عراق کا عزم کرے گا، اور ارادہ ہے کہ خلیفہ بغداد کو بھی اُس کی سرتاہیوں اور غرور کی سزا دی جائے۔

بلغان خاتون: ایک دن کی بات ہے تو میں ٹھہر جاؤں گی۔

ان تمام امور کا تصفیہ کر کے بلغان خاتون اپنے مکان پر واپس آئی اور حسین کو بُلا کے کہہ دیا ”پرسوں گوچ ہے۔ تیار رہنا۔“ حسین نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور ادب سے سر جھکا کے جواب دیا ”مجھے تو جس وقت حکم ہو، حاضر ہوں۔“

دوسرے روز منقو خان کا بیٹا طوبی خان بھی کوچ کا سامان کرنے لگا اور اس کے ساتھ کے لیے چالیس ہزار جوانوں کو تیاری کا حکم دیا گیا۔ آخری رات سپاہ نے عجیب ذوق و شوق اور بڑی دھوم دھام میں بسر کی۔ قراقرم کے درود یوار سے جوش و خروش نمایاں تھا۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ لوگ ادھر ادھر دوڑے پھرتے تھے۔ جو اپنے گھروں اور نیمیوں میں تھے، وہ خوشی خوشی اسلخ بھی دُرست کرتے جاتے تھے اور عزیزوں، بیوی بچوں سے بھی رخصت ہوتے جاتے تھے۔ صبح سوریے ہی کوچ کا طبل بجا اور تاتاریوں کے غول اپنے اپنے نشانوں اور بیروں کے نیچے جوشِ مُسرت میں کو دتے۔ اپنے قومی گیتوں کو گاتے اور شور کرتے ہوئے بڑھے۔

یہ فوج مختلف حصوں میں تقسیم ہو کے روانہ ہوئی۔ ہراول کے پانچ ہزار جوان آگے بڑھ گئے۔ پھر جان شاروں کی پانچ پانچ ہزار لکڑیاں داہنے بائیں پھیل گئیں۔ پانچ ہزار کا ایک گروہ پیچھے غول میں رہا اور درمیان یا قلب میں پورے ۲۰ ہزار ترک جدا جد افوجوں اور پرچموں میں بٹے ہوئے آگے پیچھے روانہ ہوئے، جن کے نیچے میں طوبی خان اور بلغان خاتون دو مضبوط گٹھے ہوئے ترکی گھوڑوں

پرسوار تھے۔ تاتاری کمانیں اور نیزے کے چاروں طرف حلقہ کیے ہوئے تھے اور ہر چہار طرف سے جوش والے کی صدائیں اور فتح و نصرت کے نعرے باندھوڑتے تھے۔ تاتاریوں کا یہ طوفان ایک ٹڈی ڈل کی طرح راستے کی تمام چیزوں کو خراب کرتا چلا جاتا ہے جو گاؤں نظر آتا، آدمیوں سے خالی ملتا۔ اس لیے کہ ان بے رحم و جری لیثروں کی آمد کی خبر سنتے ہی لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کے بھاگ جاتے اور ان کے ویران اور غیر آباد مکانوں میں آگ لگادی جاتی۔ یہ لوگ جوں جوں آگے بڑھتے، شہر اور گاؤں مسمار و مُنهدم اور جل جل کر خاک سیاہ ہوتے جاتے۔ رعایا میں سے مرد، عورت، بولڑھا، بچہ جو شخص ملتا، انسان کا شکار کھینے والے وحشیوں کے ہاتھ سے قتل ہوتا۔ یہ لوگ تمام علاقے میں خلقِ خدا کو تباہ کرتے ہوئے بحرِ خزر کے کنارے کنارے چلے اور مازندران میں پہنچے۔ پھر ان کے گاؤں تاخت و تاراج کر کے آذربائیجان کی طرف نکل گئے۔ اس لیے کہ ہلاکو خان کے اسی طرف ہونے کی خبر تھی کیونکہ وہ سلطانِ پیغم کے تعاقب میں شمال کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مگر بلغان خاتون اپنے ساتھ کے پانچ سوسواروں کے ساتھ جبلِ طالقان کے دامن میں نہر ویرنجان کے قریب خیمنہ زن ہو گئی (عین اسی مقام پر جہاں اس ناول کی ابتداء میں ہم نے زمر داور حسین کو پایا تھا۔)

جس وقت یہ پانچ سوتا تاری اُس سرز میں پر پہنچے ہیں، رمضان کی ۱۸ اتارخ تھی۔ مجبوراً چند روز اسی جگہ فروکش رہنا پڑا، جس سے زیادہ کوئی مصیبت تاتاری لشکر کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ جب تک لوٹتے مارتے رہتے، اسی وقت تک اچھے اور خوشحال رہتے اور جہاں کسی جگہ قیام ہو گیا، محض اس وجہ سے کہ نئے شہر اور قبے اُن کو نہ ملتے، فاقہ کرنے لگتے۔ یہاں بھی یہی

مجبوری تھی۔ سب نے انتظار کر کے دن فقر و فاقہ سے بسر کیے۔ نویں دن ٹھیک ۲۷ تاریخ تھی۔
بلغان خاتون صبح ہی سے کسی انتظار میں تھی اور جوں جوں دیر ہوتی، اُس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔
آخر جب اس نے دیکھا کہ وقت نکلا جاتا ہے تو پس و پیش کے بعد تین فوجی جوانوں کو ساتھ لے
کے چل کھڑی ہوئی۔ حسین اُس کا رہبر ہوا۔ باقی تمام ہمراہی وہیں چھوڑ دیے گئے۔ حسین اور
تا تاری شہزادی سڑک چھوڑ کے نہرو رینجان کے کنارے کنارے چلے اور بدقت و دشواری گھائیوں
اور جنگلوں سے گور کے اُس مرغزار میں جا پہنچے۔ حسین نے زمرد کی قبر پر جا کے فاتح خوانی کی اور
کہا ”یہی پھر ہیں جن کے نیچے میری زمرد کا پیکر عنصری آرام کر رہا ہے۔“

بلغان خاتون نے زمرد کا خط نکال کر پھر پڑھا اور زمرد کی ہدایت کے موافق قبر کے پھروں کو خود
اپنے ہاتھوں سے ہٹانے لگی۔ چار پانچ پھر ہی ہٹے ہوں گے کہ حسب وعدہ زمرد کا دوسرا خط مل گیا
جسے کھول کے اُس نے چپکے چپکے پڑھا اور ذرا امتر ڈدھو کے سامنے کی طرف نظر بڑھا بڑھا کے دیکھنے
لگی۔ چند لمحوں کے بعد کچھ سوچا اور اپنے ایک ہمراہی کے کان میں کچھ کہنے کو بھلی۔ تا تاری سپاہی
شہزادی کا راز سُننے ہی واپس روانہ ہوا اور وہ خود حسین کی طرف دیکھ کے بولی ”چلو۔“
حسین: کہاں؟

بلغان خاتون: جہاں میں لے چلوں۔

اتنا کہتے ہی دونوں باقی ماندہ سپاہیوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور چل کھڑی ہوئی۔ حسین کی کیا
مجاہ انکار تھی۔ بے عذر ساتھ ہولیا۔

بلغان خاتون اس وادی کے شمالی کونے کی طرف چلی۔ اُسی طرف جدھر سے حسین نے کبھی پریوں کو
آتے دیکھا تھا۔ جاتے جاتے تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ ایک سر بز پہاڑ کے دامن میں پہنچی اور گو

اُس طرف کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا مگر وہ برابر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ حسین تو ایک عقیدت کیش مُرید کی شان سے بے عذر اطاعت کر رہا تھا مگر ہمارا ہی سپاہیوں کو حیرت تھی کہ شہزادی انھیں کہاں لیے جا رہی ہے۔ بلکہ ایک نے بڑھ کے ادب سے پوچھا بھی کہ ادھر تو راستہ نہیں ہے۔ جس کے جواب میں بلغان خاتون نے کہا کہ تم کچھ بولو چا لو نہیں۔ خاموشی سے چلے آؤ۔ پہاڑ کی جڑ میں پہنچ کے وہ ایک تیرہ و تار غار میں گھس گئی اور ساتھیوں سے کہا۔ اس طرح چلو کہ کسی کو آہٹ معلوم نہ ہو۔، شہزادی کے حکم کے مطابق سب لوگ جہاں تک ممکن تھا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے چلے۔ غار کے اندر بالکل اندر ہیرا تھا۔ سب ہاتھوں سے ٹوٹتے اور دونوں طرف کے ٹکروں سے بچتے جاتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دور کچھ روشنی نظر آئی جس کی نسبت معلوم ہوا کہ غار کے اس طرف کا دہانہ ہے۔ آخر بلغان خاتون اس غار سے باہر نکلی۔ مگر جب غار سے نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام بھی وحشت ناک ہے اس لیے کہ یہاں بہت ہی گھنا جنگل تھا جس کے درخت اس طرح ملے ہوئے تھے کہ آفتاب کی روشنی بے مشکل زمین تک پہنچ سکتی تھی۔

شہزادی اس جنگل میں پہنچتے ہی باعیں ہاتھ کی طرف مُرگئی۔ اب اس کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ وہ درختوں میں بھنستی اور کانٹوں میں الجھتی برابر آگے چلی جاتی تھی۔ ساتھ والے اس دشوار گزار راستے کو دیکھ کے گھبرا گئے تھے اور دل میں حیران تھے۔ آخر یہ جنگل یکا یک ایک پہاڑ کے پاس ختم ہو گیا۔ یہاں پہنچ کے شہزادی پھر داہنے ہاتھ کی طرف مڑی اور پہاڑ کے دامن ہی دامن میں دور تک چلی گئی۔ ایک مقام پر پہنچ کے اسے نظر آیا کہ جیسے کسی ناگہانی صدمے کے باعث پہاڑ پھٹ گیا ہے اور درمیان میں ایک بہت ہی تنگ اور لمبی گلی پیدا ہو گئی ہے جس سے ایک سے زیادہ آدمیوں کا گز نہیں ہو سکتا۔

بلغان خاتون نے اُس گلی کو غور سے دیکھا، چاروں طرف نظر دوڑائی اور جیسے دل ہی دل میں کچھ مطمئن ہو کے اُس گلی کے اندر گھسی۔ اندر جانے سے پہلے اُس نے ایک اور ہمراہی سپاہی کے کان کی طرف جھک کے کچھ کہا جس کے ساتھ ہی وہ واپس چاگیا۔ اب شہزادی حسین اور باقی ماندہ ایک جوان کو ساتھ لے کے گلی میں داخل ہوئی۔ گلی کے اندر ایک مقام پر ایک کھڑکی ملی جسے شہزادی نے کھول کے دیکھا تو کپڑوں کا ایک زنانہ جوڑا تھا اور دو مردانے جوڑے جو بالکل دھقانوں اور گائے بھینس پالنے والوں کی وضع کے تھے۔ شہزادی نے دونوں جوڑے جوڑے حسین اور دوسرے ساتھی کو دے کے کہا ”اپنے کپڑے اُتار کے یہاں رکھ دو اور یہ کپڑے پہن لو۔“ یہ کہہ کر وہ خود بھی زنانہ جوڑا پہننے لگی۔ جب سب کپڑے پہن چکے تو گویہاں اندھیرا تھا، حسین شہزادی کی وضع ولباس کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

بلغان خاتون: کیوں حسین! ٹھجپ کس بات کا ہے؟
حسین: کیا عرض کروں۔ یہ لباس پہن کے تو آپ دنیاوی شہزادی نہیں آسمانی گھور معلوم ہوتی ہیں۔

بلغان خاتون یہ بات سُن کے مسکرائی اور بولی ”بس چکے چکے چلے آؤ۔“ اور آگے روانہ ہوئی۔ یکا یک معلوم ہوا کہ آڑی چٹان نے راستہ بند کر دیا ہے۔ بلغان خاتون نے جب مڑکے دیکھا تو نیچے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا جس میں سے ایک آدمی مشکل سے سمت سمتا کے نکل سکتا ہے۔ وہ اُسی سوراخ سے نکلی اور ہمراہیوں کو بھی نکلنے کا حکم دیا۔ اس دشواری کو جھیل کے شہزادی آگے بڑھی، لیکن بظاہر ایک بہت بڑی مشکل نظر آئی۔ وہ یہ کہ آگے ایک زبردست فولادی دروازہ تھا جو دوسری طرف سے بند تھا۔ مگر بلغان خاتون نے دروازے کے داہنے بازو کے برابر سے ایک

پتھر نکالا، جس کے لئے ہی روشن دان میں ہاتھ ڈال کے اُس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ جواندر سے بند تھی۔ اس کے بعد تاتاری سپاہی اور حسین کی زور آوری سے فولادی پٹ اندر کی طرف ہٹ آیا اور جانے کا راستہ بن گیا۔

اس دروزے سے نکلتے ہی بلغان خاتون نے حیرت سے دیکھا کہ عجب فرحت بخش روح افزایش لگے ہوئے ہیں۔ پھولوں کی بہار اور طیور کی نغمہ سنجیاں دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ”واہ!“ مگر حسین جو اس مقام کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے حیرت سے دیکھ رہا تھا، شہزادی کی زبان سے یہ لفظ سُن کے بولا ”مجھے تو یہ فردوسِ بریں معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیوں کر کہوں؟“

بلغان خاتون: اب میں تمھیں گھور نظر آتی ہوں تو ضرور ہے کہ یہ باغِ جنت ہے۔ مگر ذرا غور سے دیکھو۔

کیا یہی وہ فردوسِ بریں ہے جس کی تم سیر کر چکے ہو؟ (یہ کہہ کے شہزادی مسکراتی۔)

حسین: اب یعنیہ وہی مقام معلوم ہوتا ہے۔ خداوند! میں خواب دیکھتا ہوں یا بیدار ہوں! اور دیکھیے طیور کے لغنوں سے بھی وہی آواز نکلتی ہے۔ اللَّٰمُ عَلَيْكُمْ طَهُٰرٰتُمْ فَاذْخُلُوا إِلَٰهًا خالِدًا۔

بلغان خاتون: اس کے کیا معنی؟

حسین: اللہ جل شلنه، نے قرآنِ پاک میں وعدہ کیا ہے کہ جنت میں لوگوں کا خیر مقدم ادا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر سلام ہو۔ پاک ہو گئے تم لوگ۔ لہذا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

حسین نے زبان سے تو یہ جواب دے دیا مگر اس کے دل و دماغ اور اس کی آنکھوں پر ساعت

بساعت زیادہ حیرت مستولی ہوتی جاتی تھی۔ وہ ہر چیز کو گھبرا گھرا کے دیکھتا اور بار بار کہہ اٹھتا ”یا تو میں آسمان پر پہنچ گیا ہوں یا فردوسِ بریں نیچے اُتر آیا ہے۔ یہ تو بعینہ وہی باغ ہے جس میں زمرد کے ساتھ سیر کرتا پھرتا تھا۔“

بلغان خاتون: فردوسِ بریں میں تم پہنچ گئے۔ اب مطمئن رہو۔ زمرد سے بھی ملاؤں گی۔ حسین کو جنت میں پہنچ جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ شہزادی کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی اُس کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا:

”آپ نے اس راہ میں میری رہبری کی ہے۔ مجھے اب شیخ علی وجودی سے بھی دستگیری کی امید نہ تھی۔ آپ کا یہ احسان ہمیشہ میرے لوح دل پر نقش رہے گا۔“

بلغان خاتون: (حسین کو زمین سے اٹھا کے) ذرا صبر و تحمل سے کام لو۔ زمرد سے ملنے کے لیے شرط ہے کہ چکے سے ساتھ ساتھ چلے چلو۔ ایسا اضطراب کرو گے تو کام بگڑ جائے گا۔ یہ کہہ کے شہزادی نے پھر زمرد کا خط نکال کے پڑھا اور دونوں ہمراہ یوں کو ساتھ لیے ہوئے ایک جانب چل کھڑی ہوئی۔ چند منٹ میں وہ قصروں اور کوشکوں کے قریب تھی۔

حسین اس نظر فریب منظر کو کھڑا نہایت ہی حیرانی واخود رفتگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ناگہاں ایک حسین و ناز نیں عورت شہزادی کے سامنے آئی اور اُس کے پاؤں پھومنے کو جھکی۔

بلغان خاتون: تم کون ہو؟ (مگر اس کے ساتھ ہی حسین کی نظر اس پر جا پڑی۔ ایک بے اختیاری و خود فراموشی کے جوش میں اس کی زبان سے نکلا ”زمرد!“ اور دوڑ کے اُس سے لپٹ گیا۔) زمرد: (حسین کو علیحدہ کر کے) ذرا صبر سے کام لو پہلے مجھے شہزادی کے سامنے اپنی احسان مندی ظاہر کرنے دو۔

بلغان خاتون: تو تم ہی زمرد ہو۔ (یہ کہہ کہ اُس نے زمرد کو گلے سے لگالیا اور بولی) ”بہن، میرا کیا احسان ہے۔ ہاں تمھاری البتہ انتہا سے زیادہ شکر گزار ہوں۔ اگر تم مد نہ کرتیں تو مجھے غم والم سے نجات نہ ملتی۔

زمرد: (مسکرا کے کسی قدر نداشت سے) مگر شہزادی، اس میں میری خود غرضی بھی تو تھی۔

بلغان خاتون: اسے خود غرضی نہ کہنا چاہیے۔ یہ اس سادہ لوح نوجوان پر تمھارا احسان ہے کہ اپنی محبت سے اسے عزت بخشی اور اتنے بڑے اور اس قدر گھرے فریب سے نجات دلائی۔ اس کے بعد زمرد حسین کی طرف متوجہ ہوئی اور پوچھا ”اب تو تم پر سارا راز گھل گیا؟“
حسین: راز کیسا؟ میں نے شہزادی کے حکم کی اطاعت کی اور صرف اس وجہ سے کہ تمھاری ہدایت تھی۔

بلغان خاتون: نہیں۔ ابھی میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نہ تمھارا کوئی خط دکھایا ہے۔ مگر جب سے یہ باغ میں داخل ہوئے ہیں انتہا سے زیادہ پریشان ہیں اور بدحواس ہیں۔ اب اپنے ساتھ لے جاؤ اور جو کچھ کہنا ہو کہہ دوتا کہاں کی وحشت ذرا دور ہو اور آدمی بنیں۔

زمرد: افسوس! غلطی میں یا ایسے ایسے کام کر چکے ہیں کہ اطمینان تو انھیں بڑی مشکلوں سے نصیب ہو گا۔

بلغان خاتون: لیکن اب یہی مصلحت ہے کہ انھیں اپنے قصر میں لے جاؤ اور کوشش کرو کہ ان کی آنکھیں کے سامنے سے فریب کا پردہ اٹھ جائے۔ مگر ہاں، پہلے مجھے یہ بتا دو کہ یہاں کسی کا خوف تو نہیں؟ تمھارے لکھنے کے مطابق میں آنے کو تو چلی آئی مگر اندر یہ شے ہے کہ کوئی خرابی نہ اٹھ کھڑی ہو۔

زمرد: شہزادی! آپ مطمئن رہیے۔ کسی بات کا اندر یشہ نہیں۔ آج شام تک آپ یہاں بے کھلکھلے رہ سکتی ہیں۔ مگر وہ جو میں نے لکھا تھا، اس کا بھی بندوبست آپ نے کر لیا ہے؟
بلغان خاتون: سب سامان کر چکی ہوں۔ اگر چہ اس کے متعلق مجھے ذرا ساتر ڈد ہے۔

زمرد: وہ کیا؟

شہزادی: خیر، کوئی مضاائقہ نہیں۔ اس کو پھر بیان کروں گی۔

یہ کہہ کے اُس نے باقی ماندہ جوان کو بھی جو ساتھ آیا تھا کچھ کان میں کہہ کے واپس بھیجا اور زمرد سے پوچھنے لگی ”یہ بتاؤ، قلعے پر کدھر سے حملہ ہو سکتا ہے؟“

زمرد: آپ قلعے میں ہیں۔ مگر اتنا حصہ قلعے سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اگر چہ غیر لوگ نہر ویرنجان کے ذریعے سے اور بیرونی دیوار کے نیچے سے نکال کے لائے جاتے ہیں مگر اسی نہر کے اس طرف خورشاہ کا محل ہے۔

حسین: (چونکر) خورشاہ کا محل! وہ یہاں کہاں؟ وہ تو الموت میں ہے۔

بلغان خاتون: (ہنس کے) اب انھیں ان کے قصروں میں وہیں پہنچا دو جس کے دیکھنے کا انھیں شوق ہوگا۔ باقی با تیں پھر آ کے کرنا۔ یہ اگر یہاں موجود ہے تو بات نہ کرنے دیں گے۔

زمرد: بے شک شہزادی۔ آپ بجا فرماتی ہیں۔ انھیں وہاں بٹھا کے ابھی آتی ہوں۔

یہ کہہ کے اُس نے حسین کا ہاتھ ہاتھ میں لیا، جو ایک خود فراموشی کے عالم میں کھڑا تھا اور شہزادی کو تنہا چھوڑ کے اُسے کھینچتے ہوئے اپنے قصر دری میں لے گئی۔ حسین راستے بھراں سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا مگر زمرد نے ہر سوال کے جواب میں یہی کہا کہ پھر بتاؤں گی اور اُسے قصر میں بٹھا کے شہزادی کے سامنے واپس آئی۔

بلغان خاتون: ہاں تو، خورشاہ کے محل کو یہاں سے راستہ گیا ہے؟

زمرد: جی ہاں۔ وہ روز یہاں آ کے عیش و عشرت میں مشغول ہوا کرتا ہے۔ آپ اس راستے سے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بہ آسانی پہنچ جائیں گی۔ پہلے نہر کا پل ہے۔ اُس سے اُترتے ہی آپ کو ایک راستہ ملے گا جو سیدھا خورشاہ کے حرم سرا کو گیا ہے جس میں داخل ہوتے ہی آپ سمجھ لیجیے کہ الگوموت کے قلعے میں پہنچ گئیں۔ اور آج عید کا دن ہے اور معمول ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص نہ جنت میں لا یا جاتا اور نہ خورشاہ آ سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس علاقے کے تمام معزز اور مُقرب لوگ نیز دُور دُور کے بر سرا وردہ نقیب امام کی زیارت کو آتے ہیں، اور قلعے میں عام معتقدین کا بڑا بھاری مجمع رہتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو رمضان کی ۲۷ تاریخ کو بُلا یا ہے، کیونکہ اس دن لازمی طور پر یہ باغ غیروں سے خالی رہتا ہے اور خود خورشاہ کو بھی تین چار دن تک یہاں آنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر اور کوئی زمانہ ہوتا تو اب تک آپ کے آنے کا حال قلعے میں معلوم ہو گیا ہوتا۔

بلغان خاتون: تو ابھی تک کسی کو ہمارے آنے کی خبر نہیں؟

زمرد: بالکل نہیں۔ اول تو یہاں کوئی مرد نہیں جو لوگوں کو خبر کر کے لڑائی کا سامان کرے اور شاید کوئی عورت بھاگ کے چلی بھی جاتی مگر میں نے آج صبح سے شہر کے پل کے پھاٹک میں ٹھفل لگادیا ہے اور نجی میرے پاس ہے۔ لہذا ممکن نہیں کہ کوئی بھی بھاگ کے قلعے میں جا سکا ہوا اور لطف یہ کہ ان دونوں ادھر سے بھی کوئی آنے والا نہیں۔

بلغان خاتون: یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ تم کہتی ہو آج عید ہے، جب کہ قلعے میں خوشی کا جوش و خروش ہو گا۔ پس کوئی فکر نہیں۔ آج شام سے پہلے ہی ہمارا حملہ ہو جائے گا۔ مگر زمرد مجھے ایک بات

کا تردد ہے۔ جس فوج کو میں نے اپنی مدد کے لیے بُلا یا تھا، اُس کا بھی تک پتا نہیں۔ میرے ہمراہ صرف پانچ سو سپاہی ہیں جو شاید کافی نہ ہو سکیں۔

زمرد: میں تو صحیتی ہوں کہ پانچ سو جوان بھی قلعے پر ادھر سے جا کر قبضہ کر لیں گے۔

بلغان خاتون: مگر مجھے یقین ہے کہ ہماری کمک آئے گی ضرور۔ صرف شام تک کی مہلت چاہیے۔

زمرد: شام کیا معنی، آپ کل تک یہاں مخفی رہ سکتی ہیں۔ کوئی اندر یہشے کا مقام نہیں۔ پس جب تک کمک آئے، یہاں آرام فرمائیے۔ آپ تھک بھی گئی ہوں گی۔ ستانے کے لیے اچھی مہلت مل گئی۔ اس کے بعد شہزادی نے پوچھا ”اور زمرد، یہ لباس جو تم نے میرے دونوں ساتھیوں کے لیے تجویز کیا ہے، اس میں کیا مصلحت تھی؟“

زمرد: آپ کا لباس تو وہی خُوروں کا لباس ہے جس کو لوگ یہاں حلہ جنت سمجھتے ہیں۔ اس لباس کی وجہ سے کسی پر بدگمانی نہیں ہو سکتی۔

بلغان خاتون: شاید اسی لیے مجھے وہ کپڑے پہنے دیکھ کے حسین نے کہا تھا کہ آپ حور معلوم ہوتی ہیں۔

یہ جملہ سُن کے زمرد بھی نہیں اور بولی ”مگر اپنے لباس کے متعلق انھوں نے کچھ نہ کہا؟“

بلغان خاتون: اور ہاں، مردوں کے لیے ایسا بے ہودہ لباس تم نے کیوں تجویز کیا؟

زمرد: اس لیے کہ مردوں میں یہاں عام طور پر وہی دودھ والے آیا کرتے ہیں جو یہاں کی نہروں اور حوضوں میں دودھ اور شراب بھرتے ہیں۔ اگر کوئی مرد اس لباس کو پہنے ہوئے یہاں آئے تو کسی کو بھی خیال نہ ہو گا کہ کوئی غیر ہے۔

بلغان خاتون: مگر ایسا نہ ہو کہ کسی کو خبر ہو جائے اور قبل از وقت راز کھل جائے۔

زمرد: کسی کو خبر نہ ہوگی۔ آپ شوق سے یہاں فروکش ہوں۔ عید کے دن کسی کو یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

بلغان خاتون: بہتر، میں یہیں ٹھہر دیں گی۔ مگر مجھے چل کے ذرا جنت کی سیر کراؤ اور پُل سڑک بھی دکھادو تاکہ راستہ خوب پہچان لوں۔

زمرد: چلیے۔

اس تجویز کے بعد دونوں حسین و ناز نیں عورتیں قصر دیوار کی سیر کرتیں اور باغوں اور چمنوں کی بہار دیکھتی ہوئیں اس بڑی نہر کے کنارے پر پہنچیں جس کے راستے سے لوگ سونے کی کشتی میں بٹھا کے جنت کے اندر لائے جاتے تھے۔ اس نہر کے پُل کے پھاٹک میں قفل لگا ہوا تھا جسے زمرد نے کھولا اور دونوں لڑکیاں دوسرا میدان کے میدان میں اتریں۔ اُدھر بھی ایک پھولوں کا مُسطّح تختہ دُور تک بنایا ہوا تھا اور درمیان میں سے ایک سڑک گزرتی تھی جو تھوڑی دُور تک کھلی فضا میں جا کے بڑے سایہ دار درختوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ انھی درختوں کے اُس طرف حرم سرا کا راستہ تھا۔ یہ دلچسپ سیر کر کے شہزادی واپس آئی اور زمرد کے انتخاب کے مطابق عالی شان فیروزہ کے کوشک میں جا کے فروکش ہو گئی۔ زمرد دیر تک اُس کے پاس بیٹھی رہی اور جب دیکھا کہ شہزادی لیٹ کے آرام کیا چاہتی ہے تو اُس سے رخصت ہو کے دروازہ اندر سے بند کروادیا اور اپنے قصر کی طرف روانہ ہوئی۔

افشاۓ راز

حیرت زدہ حواس باختہ نوجوان حسین کو زمر دشہزادی کی تجویز کے مطابق قصر دری میں چھوڑ کے واپس گئی تو وہ گھبرا کے ایک ایک کو دیکھتا اور اپنے دل سے پوچھتا تھا کہ کیا حقیقت میں یہ وہی مقام ہے جہاں وہ امام قائم قیامت کی وجہ سے آیا تھا۔ مگر وہ تو ملاعِ اعلیٰ پر تھا اور یہ زمین، ہی پر ہے۔ لیکن کیوں کر شک کیا جائے۔ خود زمر دبھی تو موجود ہے۔ اگر یہ کوئی دنیاوی باغ ہے تو وہ کیوں کر چلی آئی؟ خود اسی نے لکھا تھا کہ جنت میں ہوں اور فردوسِ بریں کی سیر کر رہی ہوں۔ آخر سے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد وہ محل کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا اور ہر ایک عمارت، ایک ایک چمن کو غور سے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ ہر چیز وہی اور ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ پہلے نظر سے گزری تھی۔ قصروں کی روکار پر اسی طرح جو ہرات جزے ہوئے تھے۔ ان کی وضع بھی ویسی ہی تھی۔ چمنوں کا بھی وہی رنگ اور وہی نقشہ تھا۔ سڑکیں اور روشنیں بھی اسی طرح رنگ برنگ اور نظر فریب تھیں۔ سونے چاندی کے تخت و تاج بھی اُسی پہلی شان سے تھے۔ نہریں بھی اُسی مستانہ روی سے بہ رہی تھیں۔ ہاں صرف ایک چیز کی کمی تھی، اور وہ وجد میں لانے والا گانا تھا۔ مگر جب اس نے طیور کی زبان سے وہی ترانہ خیر مقدم سُن لیا تو ادھر سے بھی شک جاتا رہا۔ وہ اسی پس و پیش میں تھا کہ ایک طائر نے ایک تازہ اور شاداب سیب چونچ میں لا کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ بھی خاص فردوسِ بریں کی علامت ہے۔“

حسین کے خیالات میں ایک عجیب قسم کا تردد و اضطراب تھا۔ یہ معملاً کسی طرح حل ہونے میں نہ پایا

تحاکہ سامنے سے زمر دنظر آئی جو شہزادی سے رخصت ہو کے اُس کے پاس آ رہی تھی۔ اس کی دل رُبا اور ناز آ فریں صورت دیکھتے ہی وفورِ جوش سے حسین کا دل دھڑ کنے لگا اور عشق کے جذبات نے یک بیک ایسی بے اختیار حالت طاری کی کہ برآمدے سے اُتر کے استقبال کو دوڑا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

حسین: پیاری زمرد! اللہ بتاؤ کہ میں کس عالم میں ہوں اور یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟
زمرد: (مسکرا کے) وہی دیکھ رہے ہو جو ایک دفعہ دیکھ چکے ہو۔

حسین: یعنی وہی ملاعِ اعلیٰ پر ہوں؟
زمرد: واقعی جو ساز و سامان نظر آ رہا ہے اس لحاظ اس جگہ کو ملاعِ اعلیٰ ہی کہنا چاہیے۔
حسین: کہنا چاہیے؟ تو کیا اصل میں نہیں؟

زمرد: تم اپنے دل سے پوچھو۔ تم نے اس مقام کو زمین پر پایا آسمان پر؟
حسین: آیا تو زمین ہی کے راستے ہوں۔

زمرد: تو زمین ہی پر سمجھیں۔
حسین: مگر کیوں کر سمجھوں؟ تمہاری قبر پر تمہارے وہ خطوط یہاں تک آنے کے ذریعے ہیں۔
ان تمام باتوں میں جس چیز کا خیال کرتا ہوں، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ کوئی اور عالم ہے
اور یہاں کی مسروتوں میں دنیاوی مسروتوں سے بالا ہیں۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں قصر میں داخل ہوئے اور زمرد نے کہا ”یہاں کی مسروتیں تو بے شک
دنیا کی مسروتوں سے بالا ہیں مگر یہ نہ سمجھو کہ تم دنیا سے نکل کے کسی اور جگہ آ گئے ہو۔

حسین: پھر وہ سب واقعات جو گزر چکے ہیں، ان کی نسبت کیا خیال کروں؟

زمرد: یہ سب میری مجبوری، میری بے دست و پائی اور تمھاری سادہ لوچی کا نتیجہ ہے۔

حسین: میں اس کا مطلب نہیں سمجھا؟

زمرد: گھبراو نہیں۔ سب سمجھ جاؤ گے۔ مگر افسوس! جس قدر سمجھو گے، اُسی قدر زیادہ پریشان ہو گے اور اپنے کیے پر چھٹاؤ گے۔

حسین: زمرد! اب مجھے تیری صورت پر بھی ٹھہر معلوم ہوتا ہے۔ تو وہی زمرد ہے جو میرے ساتھ آمیل سے آئی تھی؟

حسین کی زبان سے سادگی کا سوال سن کے زمرد کو بنسی آئی مگر ضبط کیا اور ایک عجیب دل فریب ادا کے ساتھ پر معنی اور شوخ چتوں کو سے دیکھ کے بولی ”نہیں۔ دوسری ہوں۔“ اس جواب کو حسین نے سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے زمرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھ کے بولا ”وہی نورانی جسم ہے یا میرے ہی جسم کا سامانڈی پُتل؟“

زمرد: ہوش کی باتیں کرو۔ تم بالکل از خود رفتہ ہوئے جاتے ہو۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے سے ایک بہت بڑا طسم ٹوٹا ہے جس کے اثر سے تمھارے حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ ذرا ہوش میں آؤ اور حواس کی باتیں کرو کہ سارا راز، تمام سرگزشت بیان کروں۔

حسین: پیاری زمرد، جلدی بیان کرو۔ اس لاعلمی اور ناواقفی نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے۔

زمرد: اُس وادی میں ہم دونوں نے جن پر یوں کو دیکھا تھا، وہ پریاں نہ تھیں بلکہ اسی مصنوعی جنت کی حوریں تھیں۔

حسین: (حیرت سے بات کاٹ کے) مصنوعی جنت! یہ وہ جنت نہیں جس کا وعدہ مومنین سے کیا گیا تھا؟

زمرد: ذرا صبر کرو۔ خیر، تم وہاں بے ہوش ہو گئے اور مجھے وہ یہاں پکڑ لائیں۔ نہ میں ماری گئی نہ شہید ہوئی۔ مگر اس لیے کہ تم کو میرے مرنے کا یقین آ جائے، انھوں نے واپسی سے پہلے بھائی کی قبر میں ذرا تغیر پیدا کیا اور اُسی وقت رات کو مجھ سے پوچھ کے بھائی کے نام کے برادر میرا نام بھی کندہ کر دیا۔ اس سے غرض صرف یہ تھی کہ تم مجھ سے مایوس اور میرے خیالوں سے دست بردار ہو کر چلے جاؤ۔ اس وادی کی خطرناک حالت ہرملنے والے سے بیان کرو اور یہاں کی پریوں کی اہمیت ہر شخص کے دل میں بٹھا دو۔

حسین: تم تو زندہ ہو (یہ کہا اور زمرہ دکھر سے پاؤں تک گھور کے دیکھنے لگا۔)

زمرد: (جھنجھلا کے) نہیں چڑیل ہو گئی ہوں (حسین نے کچھ اس کا جواب نہیں دیا اور زمرد نے ایک لمحہ توقف کر کے پھر سلسلہ کلام شروع کیا) تو تم کو یہ دھوکہ دیا گیا اور میں یہاں لانے کے بعد انھی عورتوں میں شامل کر دی گئی جو یہاں ہُوریں کھلاتی ہیں۔ چند روز بعد دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ تم اُسی طرح میری قبر کے مجاور بننے بیٹھے ہو اور جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آخر یہاں غور کیا گیا کہ وہ وادی تم سے کیوں کر خالی ہو۔ اکثر وہ کی رائے تھی کہ قتل کر ڈالنا چاہیے۔ مگر اتفاق سے میری تدبیر کا رگر ہوئی اور تجویز قرار پائی کہ کسی ایسے طریقے سے تمھیں وطن جانے کی ہدایت کی جائے کہ کسی کا گاؤں ثابت نہ ہو اور تم بغیر اُس کے کہ کسی قسم کی بدگمانی کرو، وہ وادی چھوڑ دو۔ اس تجویز کا نتیجہ میرا پہلا خط تھا جس میں تم سے میری وصیت پوری کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ خط میرے ہی ہاتھ سے لکھا یا گیا اور مجھ سے حالات دریافت کر کے اُس کے مضمون کا مسوٰ وہ تیار کیا گیا۔ مگر حسین! وہ خط صاف کرتے وقت میں چپکے چپکے بہت روئی تھی۔ اس لیے کہ جانتی تھی

کہ خود اپنے ہاتھ سے دائیٰ مُفارقت کا سامان کر رہی ہوں۔ خیر، وہ خط تمہارے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اب بھی تم اُسی طرح بیٹھے ہو اور گویا تمہارے ارادے میں تبدیل نہیں ہوئی۔

حسین: بے شک نہیں ہوئی تھی۔ زمرد، میں تو مر جاتا اور وہاں سے نہ ہٹتا۔

زمرد: جب یہ معلوم ہوا تو ان لوگوں کو پھر فکر پیدا ہوئی۔ کئی مرتبہ خود مجھ سے کہا گیا کہ یہ تدبیر بے سود ہوئی۔ اب کیا کیا جائے؟ اب کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہ آتی تھی اور دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ غصب نہ ہو کہ یہ لوگ تمہارے مارڈا لئے پا آمادہ ہو جائیں۔ اتفاقاً انھی دنوں میں خبر آئی کہ امام نجم الدین غیشا پوری باطنیں کے خلاف وعظ کر رہے ہیں اور تدبیر میں کی جا رہی تھیں کہ کس فدائی کے ہاتھ سے وہ قتل کرادیے جائیں۔ کم بختنی یا شامتِ اعمال سے میری زبان سے نکل گیا کہ وہ تمہارے چچا اور تمہارے أستاد و مرشد ہیں۔ یہ خبر جیسے ہی یہاں کے بادشاہ خورشاد کو پہنچی اُس نے خیال کیا کہ وہ امام عالی مقام تمہارے ہاتھ سے قتل ہوں تو زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح زمانے بھر کو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب باطنیہ دلوں پر کس قدر گہرا اثر ڈالتا ہے کہ انسان اپنے عزیز و اقارب، اُستاد و مرشد تک کی پروانیں کرتا۔ تمہارے خبر سے اُن کا قتل ہونا ایک ساتھ ان باتوں کا ثبوت دے سکتا ہے کہ بھتیجے نے چچا کو شاگرد نے اُستاد کو مرید نے مرشد کو بلا تامل ثواب سمجھ کے قتل کر ڈالا۔

زمرد نے یہاں تک کہا تھا کہ حسین نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی اور آبدیدہ ہو کے کہنے لگا ”افسوس! میں نے شفیق بزرگ اور خدا شناس مُرشد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ زمرد! یہ تیرے ہی شوق میں اور تیری ہی ہدایت کی وجہ سے تھا ورنہ میں اتنے بڑے ظلم کی ہرگز جرأت نہ کرتا۔

زمرد: حسین! میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس گناہ میں مجھے شریک نہ

کرو۔ مجھے جب اس کا خیال آ جاتا ہے تو کانپ اٹھتی ہوں۔ مگر اس ذکر کو جانے ہی دو۔ ایک ہونے والی بات تھی جسے کوئی نہ روک سکتا تھا۔ میں نے اگر تمہیں اس کام کے لیے تیار کیا تو میں اپنے بس میں نہ تھی اور تم اگر آمادہ ہو گئے تو تم اپنے ہوش میں نہ تھے۔

حسین: (زور سے سینہ پیٹ کے) مگر افسوس زمرد! یہ غدر خدا کے سامنے نہ کیے جائیں گے میں نہ ہوش میں تھا نہ بے ہوش۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک گناہ عظیم کر رہا ہوں مگر تیرا شوق بار بار دل کو اٹھا کے آمادہ کرتا تھا۔

زمرد: (بے تابی سے بات کاٹ کر) پھر میرا نام! خدا کے لیے حسین مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ (آن سو بھاکے) میں نے کچھ کیا ہے، مجبوری اور بے بھی میں۔ افسوس! خود اپنے دل سے تو لعنت کی آواز سن رہی ہوں، تمہاری زبان سے بھی وہی سنتی ہوں۔

یہ کہہ زمرد زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بے اختیاری کے ساتھ جلدی سے اُس کے آنسو پوچھے اور کہا:

”زمرد! بے شک ٹو بے خطاب ہے۔ اگر میں نے تیرا دل دکھایا تو معاف کراور آگے بتا کہ پھر کیا ہوا؟“

زمرد: (روم سے آنسو پوچھ کر) پھر تم کو دوسرا خط ملا جس میں تمہیں کوہِ جودی کے غار اور شہر خلیل کے تھے خانے میں چلہ کشی کرنے اور پھر حلب جا کر شیخ علی و جودی سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ خط بھی اسی طرح بھیجا گیا کہ اس کا مسوہ لکھ کے مجھے دیا گیا اور جب میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا تو میری قبر پر رکھوادیا گیا۔

حسین: لیکن اگر اتنا ہی کام تھا کہ امام نجم الدین غیثا پوری قتل کر ڈالے جائیں تو مجھے اتنے چکر

کیوں دیے گئے اور میرے راستے میں بے کار کی دشواریاں کیوں پیدا کی گئیں؟

زمرد: اس لیے کہ تمہارے شوق میں یہجان اور بے صبری پیدا ہو۔ اگر بغیر اتنے چلے کھنچوائے اور بغیر علی وجودی کے پاس ایک سال تک انتظار کرانے کے کہہ دیا جاتا تو تم اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب پر ہرگز آمادہ نہ ہوتے۔

حسین: زمرد! تیرا شوق میرے دل میں اس قدر تھا کہ جس کام کو کہا جاتا، اُسی وقت پورا کرنے کو تیار ہو جاتا۔

زمرد: خیر، تو اُن کو نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بے وقوف ہو اور تمہارے اخلاق اس قدر کمزور ہیں۔

حسین: مگر کیوں کر کہوں زمرد! مجھے تیری باتوں کا یقین نہیں آتا۔ ان آنکھوں سے ایسی ایسی کرامتیں اور عقلِ انسانی سے اس قدر بالا باتیں دیکھے چکا ہوں کہ ان لوگوں کی خداشناسی سے انکار کرنے کی کسی طرح جرأت نہیں ہوتی۔ جن گدھوں پر ہم دونوں سوار ہو کے یہاں آئے تھے وہ تو مر چکے تھے مگر مجھے ایک نیا تازہ دم گدھا اُسی درخت سے بندھا ملا اور ایسا خوبصورت تو انہوں نہ درست اور تیز روکہ اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا کہ میری سواری کے لیے خاص خدا کے پاس سے آیا تھا۔

زمرد: وہ گدھا یہیں سے بھیجا گیا تھا۔ جس وقت تمہارے نام کا خط قبر پر رکھوا یا گیا تھا، اُسی وقت وہ گدھا ایک دوسرے راستے سے بھیج کر اُس درخت سے بندھوا یا گیا تھا۔

حسین نے اس جواب کو حیرت سے سُنا اور بولا ”عجب! مگر پھر بھی میرے شبہات دور نہیں ہوتے۔ آخر شیخ وجودی کو میرے سب حالات کیوں کر معلوم ہو گئے؟ وہ یہاں سے دس ہزار کوں کے فاصلے

پر ہیں۔"

زمرد: تمہارے روانہ ہونے کے ساتھ ہی ان کو تمام واقعات کی خبر دی گئی۔ ان کو لکھ بھیجا گیا تھا کہ امام نجم الدین کے بھتیجے، شاگرد اور مرید سے ان کے قتل کا کام لیتا ہے اور وہاں پہنچنے سے پہلے تم کوہِ جودی کے غار اور خلیل کے تھانے میں چلہ کھینچو گے۔ یہ سب باقیں ان کو دوسرے ذریعے سے معلوم ہو چکی تھیں مگر انہوں نے غیبِ دانی اور کرامت کی شان سے بیان کر کے تمہیں اپنا فریفتہ بنالیا۔

حسین نہایت ہی متعجب تھا۔ وہ حیرت کے دریا میں غرق تھا اور کسی طرح رہائی نہ ملتی تھی۔ زمرد اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گئی اور وہ سوق میں پڑا تھا کہ آخر اس نے سخت حیرت زدگی کی شان سے آنکھیں اٹھا کے دیکھا اور کہا کہ یہ سب باقیں تو سچ کہہ رہی ہے یا مجھے دھوکا دے رہی ہے؟ مجھے تو اپنی گزشتہ زندگی ایک خواب سی معلوم ہوتی ہے۔ مُخترِ ڈدھوں کہ اس ملاقات اور ان سب باتوں کو خواب سمجھوں یا ان تمام واقعات کو جو تجھ سے جدرا ہونے کے بعد پیش آئے؟ کیا حقیقت میں میں اتنا بڑا بے وقوف ہوں کہ ایسے عظیم الشان فریب اور جمل میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن زمرد اگر یہ سب سکھائی باقیں تھیں تو علی وجودی کو اُسی قدر حال معلوم ہوتا جس قدر یہاں بتایا گیا تھا۔ یہ کیوں کر معلوم ہو گیا کہ میں شہرِ خلیل کے مجاوروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔

زمرد: حسین! تم حقیقت میں بڑے سادہ لوح ہو۔ اس کا سبب میں بغیر جانے سمجھ گئی اور تم نہیں سمجھ سکے۔ لیکن درحقیقت تم مجبور ہو۔ تمہارے دل و دماغ پر ہر طرف سے اتنا اثر ڈالا گیا کہ بمشکل ان باتوں کو اپنے دماغ سے نکال سکتے ہو۔ تم کو نہیں معلوم کہ باطنین دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان سازشوں کا جال ہرگاؤں اور چھوٹے قصبے تک پڑا ہوا ہے۔ علی وجودی کے

ساتھ تم پورے ایک سال رہے۔ ممکن نہیں کہ اُس کا حال تمھیں نہ معلوم ہو گیا ہو۔

حسین: ہاں، میں نے البتہ یہ دیکھا کہ ان کے معتقد تمام اطرافِ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال ایک دفعہ ان کی زیارت کو بھی آتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی نظر آیا کہ وہ لوگ پوشیدہ طور پر اور صرف رات کو مل کے چلے جاتے ہیں۔

زمرد: اسی سے سمجھ سکتے ہو کہ ان کے کان میں خبریں پہنچنے کے لئے بڑے ذریعے موجود ہیں۔ تم نے جس وقت اس وادی کو چھوڑا تھا آخروڑ حلب تک ہر منزل اور ہر مقام پر تمھاری نگرانی ہوتی ہو گی اور تمھاری روز روز کی خبر علی وجودی کو پہنچتی ہو گی۔ کچھ تم ہی پر منحصر نہیں، ان باطنیں کے پنج میں جو شخص پڑتا ہے، اسی طرح نظروں میں رکھا جاتا ہے۔ پھر کیوں تعجب کی بات تھی اگر تمھاری شہرِ خلیل کی گرفتاری کا حال ان کو معلوم ہو گیا۔

حسین: مجھے اس پر حیرت نہیں۔ حیرت کی تو یہ بات ہے کہ شیخ کہتے تھے انھی کے اشارے سے باطنیں نے حملہ کر کے مجھے قید سے آزاد کرایا۔

زمرد: کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بے شک اسی وجودی نے تمھارے چھڑانے کے لیے اپنے معتقدوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا ہو گا۔

حسین: مگر کیونکر حکم دے گا؟ میری گرفتاری کی خبر پہنچنے اور وہاں سے حملے کا حکم آنے میں بھی آخزمانہ لگتا۔ وہاں تو یہ واقعہ پیش آیا کہ جس رات میں نکلنے والا تھا، میرے باہر آنے سے پیشتر ہی خلیل کا حاکم باطنیں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور پھر میں گرفتار ہوا تو اس کو پورا ایک دن نہیں گزرنے پایا تھا کہ ان کا ایک بڑا گروہ شہر میں آپڑا۔ ان تمام باتوں کی تجھیں اتنی جلدی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

زمرد: (ذراتا مل کر کے) یہ کون مشکل ہے۔ باطنیں کو معلوم ہو گا کہ تم کس روز تھے خانے سے اُترے تھے اور کس روز نکلو گے۔ اس زمانے میں انہوں نے شیخ علی وجودی کو خبر کر کے مدد کرنے کا اشارہ پالیا ہو گا۔ اُسی کے مطابق دن گنتے رہے اور ٹھیک چالیسویں دن جس دن تم نکلنے والے تھے، انہوں نے رئیس شہر کو قتل کر ڈالا کہ لوگ دوسرا فکر میں رہیں اور تم چپکے سے نکل کے بھاگ جاؤ۔ مگر جب انھیں خبر پہنچی کہ اُس رئیس کے قتل سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور تم مجاوروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے تو انہوں نے حملہ کر کے شہر میں کھلبی ڈال دی اور تمھیں چھوٹ کے بھاگ جانے کا موقع مل گیا۔

حسین: (زور سے سرد آہ بھر کے) تو زمرد، افسوس! یہ سب جھوٹ تھا۔ شیخ علی وجودی کا سا شخص اور اتنا بڑا مختار! کیوں کر کہوں، زمرد! ان کرامتوں اور غیب دانی کے علاوہ ان کا علم و فضل اس پائے کا ہے اور ان کے ہر ہر لفظ سے ایسی خداشناستی اور آشناۓ رموز وحدت ہونے کی بوآتی ہے کہ چاہتا بھی ہوں تو ان پر بدگمانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اتنا بڑا عالم و فاضل، ایسا نکتہ سنج و دقیقتہ رس اور اتنا بڑا فربی! میں امام نجم الدین کی صحبت میں رہ چکا ہوں۔ مگر پیاری زمرد! سچ کہتا ہوں کہ جوبات مجھے شیخ علی وجودی میں نظر آئی اور جس آسانی سے وہ دل کے شکوک رفع کرتے ہیں، امام نجم الدین میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔

زمرد: بے شک ایسا ہی ہو گا۔ مگر بات یہ تھی کہ امام نجم الدین جو دل میں آتا ہو گا، سادگی اور بے تکلفی سے کہہ گزرتے ہوں گے۔ انہوں نے اُسے بنانے اور اپنا اثر ڈالنے کی بھی کوشش نہ کی ہو گی، اور شیخ علی وجودی کا ہر لفظ بنا ہوا اور دل پر اثر ڈالنے کے لیے ہوتا ہو۔ اس کے ہر فقرے میں پوری ریا کاری ہوتی ہے۔ جھوٹ اور سچ میں بھی فرق ہے۔ کیا فربی! کی بتیں ایک راست باز

اور سادہ مزاج شخص کی باتوں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ دل نشین نہیں ہوا کرتی ہیں؟ یقین ہے کہ شیخ علی وجودی سے مل کے تم کو خداشناسی کا بہت عمدہ سبق مل گیا ہوگا۔

حسین: (زور سے سینے پر ہاتھ مار کے) ہاں! خوب سبق ملا۔ مگر حقیقت اُس وقت معلوم ہوتی جبکہ پورا جادو اثر کر چکا اور میں ساری دنیا سے زیادہ ظالم، سیہ کار، بے دین اور بے قوف بن چکا۔ افسوس! اب تمام عمر پچھتاوں گا۔ مگر زمر دکیا کہوں، اب بھی یہ سب بتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ طورِ معنی اور اس کے نورانی قصر کی صورت اس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

زمرد: ہاں! وہ بھی اس مذہب کا بڑا رُکن ہے۔ اس وقت صرف دوہی شخص شاہِ الموت کو ملے ہیں جن سے اچھا نقیب وداعی اس مذہب باطنیہ کو نہیں نصیب ہو سکا۔ طورِ معنی اور علی وجودی جو یہاں وادیِ ایکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان دونوں نے اپنی گھری سازشوں سے صد ہا اُمراوزرا اور عکما فضلاً قتل کر ڈالے۔ اور چوں کہ اس جنت و ملائِ اعلیٰ کی اصلیت کو اچھی طرح جانتے ہیں، لہذا ان پر سارا فریب کھلا ہوا ہے اور لوگوں کو جان بوجھ کر گمراہ کرتے ہیں۔ طورِ معنی بھی لوگوں سے ملتا ہے۔ مگر وادیِ ایکن نے دنیا کو بہت خراب کیا۔ دین کو جتنا ضرر اس شخص کے ہاتھ سے پہنچا ہے شاید بھی کسی کے ہاتھ سے پہنچا ہوگا۔

حسین: تو کیا طورِ معنی کے زمین دوز قصر میں بھی کوئی قدرتی کرشمہ نہیں؟ اس جنت کی طرح وہ بھی لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا ہے؟

زمرد: (مسکرا کے) کیا تمھیں ابھی شُک ہے؟

حسین: شُک نہیں پیاری زمرد! تیری باتوں کا یقین ہے۔ مگر کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں کے

سامنے سے کیسی کیسی کیفیتیں گزر چکی ہیں اور ان کا نوں سے کیسے کیسے روشن اور دفتریب الفاظ سُنے ہیں۔ خیر یہ بھی نہ ہی، مگر طورِ معنی کا قصر تو اصفہان میں ہے۔ وہاں کے غار سے یہاں کیونکر پہنچ گیا؟

زمرد: الْمُوت کا نام چونکہ کسی قدر مشہور ہو گیا ہے اور بعض لوگ بھڑک گئے ہیں لہذا جن لوگوں کی نسبت ایسا خیال ہوتا ہے، وہ اصفہان اور طورِ معنی اسی کے ذریعے سے یہاں بھیجے جاتے ہیں۔ اور سارا رازِ مخفی رکھنے کے لیے یہ تدبیر عمل میں لائی جاتی ہے کہ طورِ معنی انھیں بے ہوش کر کے اونٹوں کی قطار پر سوار کرتا ہے اور وہ راز دار اور معتبر سارے بانوں کے ذریعے سے الْمُوت تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ہر منزل پر رات کو کسی جگہ ان لوگوں کو ہوش میں لا کے کچھ کھلا پلا دیتے ہیں اور پھر بیہوش کر کے آگے روانہ ہوتے ہیں۔

حسین: (چونکر) میں نے بھی اپنے آپ کو کبھی جنگل میں پایا تھا اور کبھی پہاڑوں میں۔ تو اسی طرح میں بھی اصفہان سے روانہ ہو کے الْمُوت کے منازل کو قطع کر رہا تھا؟

زمرد: اور کیا۔

حسین: (حیرت سے) اور یہ لوگ انسان کو بیہوش کیونکر کرتے ہیں؟

زمرد: ایک پتی سے، حشیش (بھنگ) اسی کے ذریعے سے۔ کبھی اس کا شربت پلا کے اور کبھی اسے غذاوں میں اور مٹھائیوں میں ملا کے۔

حسین: (بے صبری سے) تو طورِ معنی نے جو جامِ شراب پلایا، وہ اسی حشیش کا تھا۔
زمرد: بے شک۔

حسین: افسوس! مجھے مسکرات بھی پلائے گئے اور کوئی گناہ نہیں جو اٹھا رکھا ہو۔ تو ناراض نہ ہو

کیوں کہ صرف وصال کی آرزو نے مجھے اندر کر دیا تھا۔ ورنہ میں اتنا مجنون اور فاتر العقل نہ تھا۔ محبت کی یہ حالت ہے کہ تیرے بو سے کانشان جو میری پیشانی پر موجود ہے، مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میری یہ آرزو ہی رہی کہ اس نشان کا بوس لے کے اپنے دل کی تسلی کروں مگر یہ مشتاق ہونٹ کسی طرح وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حسین کی ان باتوں پر زمرد کچھایسی شرمنائی تھی کہ اس کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی دری تک آنکھیں پنجی کیے رہی اور کئی منٹ کے بعد چذباثت شرم کو دبا کے بولی ”حسین بوس لینے سے نہ کسی شخص کے جسم پر داغ بن جاتا ہے اور نہ میں اتنی بے حیا ہوں۔“

حسین: (بات کاٹ کے) اچھا، تمہارے سوا اور کس نے میرا بوس لیا ہوگا؟ میں نے کسی کو منہ تک تو لا گایا نہیں۔

زمرد: (نظریں جھپکا کے) اب مجھ سے بے شرمی کی باتیں نہ کہلواؤ۔ یہم کو فریب دیا گیا ہے۔ یہ بوس کانشان ہے نہ عشق بازی کی پہچان۔ بلکہ یہ ایک علامت ہے جو ہر اس شخص کی پیشانی پر لو ہے سے داغ کر بنائی جاتی ہے، جو اس جنت میں لا یا جاتا ہے؟
حسین: داغ ہوتا تو مجھے یاد ہوتا۔

زمرد: یہ داغ بے ہوش کر کے بنایا جاتا ہے۔ اور جب تم الگوموت سے اصفہان کی طرف جا رہے ہو گے، اسی وقت بنایا گیا ہوگا۔

حسین: (زور سے سینہ کوٹ کے) افسوس! افسوس! گل لینے گئے تھے، داغ لے آئے۔ اس کے بعد حسین دری تک دل ہی دل میں اپنی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ پھر ایک دفعہ چونک کر بولا ”زمرد، افسوس! بڑا دھوکہ ہوا۔ تو نے مجھے اس وقت کیوں نہ جتا یا جب میں تیرے پاس لا یا گیا تھا۔

اس وقت تو بھی مجھے یقین دلا رہی تھی کہ یہ سب ملائے اعلیٰ کی چیزیں ہیں۔“

یہ سن کے زمر دا آبدیدہ ہو گئی اور ایک آواز میں بولی ”میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تمھیں دھوکہ دوں گی۔“ زمر د کو آبدیدہ اور ملول پا کے حسین کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور بے اختیاری کے ساتھ با وفا معشوقہ کے آنسو پونچھ کے کہنے لگا ”زمر د، مجھے یہ خیال نہ تھا کہ اس سوال سے تیرے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ اچھا، جا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی ایسی بات نہ پوچھوں گا۔“

زمر د: تم زخم پر نمک چھڑ کتے ہو۔ اس وقت تک تم نے سب کچھ پوچھا لیکن یہ نہ پوچھا کہ تم سے چھوٹ کے مجھ کم بخت پر کیا گزری۔ تم تو آزاد تھے۔ دنیا میں پھر رہے تھے۔ مگر آہا میں قید میں تھی۔ اور کیا کہوں کہ کس عذاب میں بتلا تھی۔ یہ بات میرے اختیار میں نہ تھی کہ کسی کو راز کا ایک ذرا سا اشارہ بھی دے سکوں۔ (اتنا کہہ کر زمر د اروقتار رو نے لگی۔)

حسین: (گلے لگا کر اور آنسو پونچھ کے) بے شک مجھ سے غلطی ہوئی کہ ان باتوں کا پوچھنا بھول گیا مگر سچ کہتا ہوں کہ میں نے اس وقت تک کوئی بات سوچ سمجھ کے نہیں پوچھی۔ جو کچھ پوچھا ہے، میں نے نہیں پوچھا بلکہ حیرت و بخودی پچھوار ہی تھی۔ ایسی از خود رفتگی کی حالت میں کوئی فرد گزاشت ہو گئی تو معاف کر دو۔

زمر د: خیرا ب تم نے یہ داستان چھیڑی ہے تو سنو۔ یہ باغ فدا یوں اور باطنیوں کے اعتقاد میں توجنت الفردوس اور ملائے اعلیٰ کا عشرت کدھا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو شاہانِ الاموت کی عشرت کے لیے سراپا حرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈیڑھ سورس کی متواتر کوشش روز بروز اس کی رونق بڑھاتی ہے۔ اور چونکہ اس سے مذہبی کام لیا جاتا ہے لہذا ہر چیز کے بنانے میں یہ کوشش کی گئی کہ اس کی خوش نمائی اور دل فریبی انسان کے حوصلے سے زیادہ اور اس کو محو حیرت کر دینے کے لیے کافی ہو۔ یہ محل جو دیکھتے

ہو کہ سونے، چاندی، مو نگے، موتی کے نظر آتے ہیں صرف نقری، طلائی جواہرات کے رنگ دیے گئے ہیں۔ ورنہ وہی اینٹ اور چونا ہے جس سے ہر جگہ مکان بنائے جاتے ہیں۔ نہروں کے جاری کرنے کا سامان موجود تھا۔ یہ بڑی نہر جو اس باغ کے درمیان میں بھی ہے اور جس پر ایک سنہری پُل قائم ہے، وہی نہر وینچان ہے جس کے کنارے تم نے مدت توں آہوز اری کی ہے۔

حسین: (حیرت سے) وہی نہر ہے؟

زمرد: وہی، یہ خاص نہر شاہی قصر سے ہوتی ہوئی یہاں آتی ہے اور یہاں چند ایسی گھاٹیوں میں ہو کے جن میں گزرنا غیر ممکن ہے، اس فرحت بخش وادی میں پہنچ گئی ہے۔

حسین: اور زمرد! وہ روشنی کیسی تھی جسے ٹو نے نورِ یزدانی بتایا تھا؟

زمرد: وہ روشنی صرف یہ تھی کہ ارد گرد کے پہاڑوں پر رات کو بہت تیز روشنی اور مہتابیاں چھوڑی جاتی ہیں جن کا عکس یہاں کے آئینوں اور شیشوں پر ڈال کے قوی اور تیز کیا جاتا ہے۔ اس روشنی کا سامان صرف اس زمانے میں کیا جاتا ہے جب یہاں کوئی شخص معتقد بنانے کے لیے لایا گیا ہو۔ اس وقت سب کو حکم رہتا ہے کہ جب وہ روشنی تیزی سے چمکتے تو چلا کے کہیں ہند الہی مَا وَعَدْنَیْ رَبِّی - اور وہ دوا اور شراب کے حوض بھی اسی ضرورت کے موقع پر لبریز کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کا تختوں پر بیٹھنا اور غلامان کا شراب پلانا اور ان کی بے فکری و خالص مسترست کے تماشے بھی اسی موقع پر دکھائے جاتے ہیں۔

حسین: اور یہ طیور کا نغمہ اور ان کا پھل توڑ توڑ کے لانا؟

زمرد: یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چند سدھائے طیور چھوڑ دیے گئے ہیں جن کو پھلوں کے توڑ لانے اور بغیر چھیڑ رہے ہوئے لوگوں کے سامنے رکھ کے اڑ جانے کی مشق کرادی گئی ہے۔ اسی

طرح یہاں کے طیور کو قرآنِ پاک کی یہ آیت ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طَبَقْتُمْ فَادْخُلُواْ بِإِحْمَالِ دِينِ۔“ یاد کرائی گئی ہے جس کو ہر وقت رٹا کرتے ہیں۔

حسین: بڑا گھر افریب ہے! بھلا کوئی کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہاں، زمرد! تو جنت کے راز بتانے میں اپنی سرگزشت کہنا تو بھول ہی گئی۔

زمرد: میری مصیبت کیا پوچھتے ہو۔ میں ہی تھی جوان سب آفتوں کو جھیل گئی۔ اور کوئی ہوتا تو اب تک خاک میں مل چکا ہوتا۔

حسین: نہیں، پیاری زمرد! ایسی باتیں زبان سے نہ نکال۔ میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے وہ مصیبتوں کٹ گئیں اور ہم پھر ایک دوسرے کے آغوش میں ہیں۔

زمرد: اصل میں میں صرف ایک حُور بنانے کے لیے لائی گئی تھی۔ خورشاہ اور اس کے ہمراز اہل دربار کو ہمیشہ کسی خوبصورت عورت کی حُسْنِ بُحُر رہتی ہے تاکہ اس کے حسن و جمال سے جنت میں زیادہ دلچسپی پیدا کریں۔ جب میں خورشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو بد نصیبی سے اس کی نظر میں معمول سے زیادہ اور جنت کی تمام حُوروں سے بڑھ کے ڈھونڈنے کی حُسْنِ بُحُر ثابت ہوئی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مجھے خاص اپنے لیے مخصوص کر لے۔ میں یہ خبرُ سن کے انتہا سے زیادہ پریشان ہوئی اور آخشدل میں فیصلہ کیا چاہے مارڈا لی جاؤں مگر اس بے عزتی کو گوارانہ کروں گی۔ ابتدا میں مجھے طرح طرح کے لاچ دیے گئے۔ بتایا گیا کہ اُس کی بی بی ہونے کے بعد تاج میرے سر پر رکھا جائے گا اور میں عالی مرتبہ ملکہ ہوں گی، مگر میں نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ جب اُسے میری رضامندی سے ما یوسی ہوئی تو وہ ظلم پر آ مادہ ہوا اور مجھے طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ اڑھائی مہینے اسی حال میں گزرے۔ ہر گھر میں ہر پل موت کا انتظار کرتی تھی۔

معشوقة باوفا کی یہ مصیبت و فاکیشی سُن کے حسین کی آنکھوں میں آنسو بھرا گئے اور ٹھنڈی سانس لے کے کہنے لگا ”زمردیم رے لیے تو نے بڑی مصیبتوں اُٹھائیں۔“

زمرد: یہ مصیبت نہ تھی بلکہ میں اس کو راحت سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ بے عزتی اور آبروریزی سے پچھی ہوئی تھی۔ اب خورشاہ ناکامی کے غصے میں میرے قتل پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اتفاق سے کسی دوست نے رائے دی کہ ایسے کام جن کا کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے سے تعلق ہو، ظلم جو را اور زبردستیوں سے نہیں نکلتے۔ بہتر ہو گا کہ زمرد چند روز کے لیے جنت کے ایک محل میں چھوڑ دی جائے۔ وہاں جب ایک عرصے تک راحت و عشرت میں رہے گی تو اپنے رنج و غم بھول جائے گی اور آخر جوانی کے جذبات غالب آکے اُسے خود ہی آپ کی معشوقة بننے پر آمادہ کر دیں گے۔ یہ رائے اُسے پسند آئی اور میں اُس کے محل سے لا کے اس جنت اور اسی قصر میں رکھ دی گئی۔ یہ ایسا محفوظ مقام ہے کہ خورشاہ کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کبھی پرند بھی پر مار سکے گا۔ باہر کا کوئی شخص نہ آ سکتا تھا۔ جو معتقد بنانے کے لیے بھی لائے جاتے تھے تو ان کی ہر طرف سے نگرانی ہوتی تھی اور کوشش کی جاتی تھی کہ سوائے ایک دو بات کرنے کے میں ان سے زیادہ مل بھی نہ سکوں۔ اور وہ پر کیا نخسر ہے، جب تم سے ملی ہوں اس وقت بھی ان امور کی پوری نگرانی ہوتی تھی۔ یہ مجال نہ تھی کہ سوائے تمہارے بہکانے اور بہلانے کے میں تم سے ذرا بھی بے تکلف ہو سکوں۔ اب مجھے ہر بات کا آرام تھا۔ رات دن عیش و عشرت میں گزرتی تھی۔ خورشاہ کے اشارے کے موافق یہاں کی تمام حوریں میری لوگوں یا بنی رہیں۔ وہ ہر وقت میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ حسین! یہ سب سامانِ عشرت موجود تھا مگر میرے دل کو کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ تمہاری صورت ہرگز ٹھیک آنکھوں کے سامنے رہتی اور طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتی تھی کہ

کسی طرح یہاں سے بھاگوں۔ انھی دنوں تمھارے قتل کے بارے میں مشورے ہوتے اور میرا ہو خشک ہوا کرتا۔ ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ایک لق و دق میدان میں کھڑی ہوں۔ ناگہاں سامنے سے تم آئے اور مجھ سے ملنے کو بے تحاشا دوڑے۔ یکا یک کسی شخص نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر تمھارے سینے میں ایک پُھری ماری۔ تم زخم کھاتے ہی سینہ پکڑ کے کھڑے ہو گئے اور میں بے اختیار رو تی اور چینیں مارتی تمھارے قریب دوڑی۔ پس اسی حال میں چینتے چینتے میری آنکھ گھل گئی۔ اب کہاں چین پڑ سکتا تھا۔ باقی رات میں نے رورو کے بسر کی اور صبح کو حیران و پریشان بیٹھی تھی کہ مرجان نام یہاں کی جو رجوبی مجھ سے کسی قدر مانوس ہو گئی تھی اور جس سے میں کبھی کبھی دو ایک باتیں کر لیا کرتی تھی، میرے پاس آئی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولی ”زمردا تم نے کچھ اور بھی سنا ہے؟ وہ نوجوان حسین جو تمھارے ساتھ تھا، اب تک اُسی وادی میں تمھاری قبر سے لپٹا بیٹھا ہے۔“ اس موقع پر مجھے ضبط سے کام لینا چاہیے تھا مگر رہا نہ گیا۔ بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کے بول اٹھی ”حسین اب تک وہیں ہیں؟“

مرجان: ہاں، مگر اب یقین ہے کہ ایک دو ہی روز میں وہ مقام ان سے خالی ہو جائے گا۔

میں نے گھبرا کے پوچھا ”کیوں؟“

مرجان: وہ مقام ہم لوگوں کی سیر گاہ ہے اور اسی سبب سے خورشاد چاہتے ہیں کہ وہاں کوئی ایسا شخص نہ رہے جو ہمارا راز نہ جانتا ہو۔ تمھارے ساتھی نوجوان کی نسبت پہلے تو یہ خیال تھا کہ جب بالکل مایوسی ہو جائے گی تو چلا جائے گا۔ اسی غرض سے تمھاری قبر بتا دی گئی ہے۔ پُھر پر تمھارا نام کندہ کر دیا گیا ہے کہ تمھارے مرنے کا اُسے یقین ہو جائے اور واپس ہو جائے اور لوگوں کو بھی ادھر آنے سے روکے۔ مگر یہ تدبیر بیکار گئی۔ لہذا مجبور ہو کے اب یہ تجویز قرار پائی کہ جس

طرح بنے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

”حسین! میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جملہ سنتے ہی میرے دل کی حالت کیا ہوئی، میں گھبرا کے بالکل بے اختیاری کے ساتھ کہہ اٹھی ”تو پھر مجھے بھی مارڈا لو۔“

میری بدحواسی دیکھ کر مرجان بولی ”اگر اس کو بچانا چاہتی ہو تو ایک کام کرو۔ خورشاہ کے سامنے چل کر خود ہی اپنی زبان سے سفارش کرو۔“ یا یہی بات تھی جس کو میں ہرگز نہ ماننا چاہتی تھی۔ فقط اتنے خیال سے کہ تمہاری جان بچتی ہے، طوعاً و کرہاً گئی۔ اور جب اس نے مسکرا کے مجھ سے بات کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے آہ وزاری کے ساتھ کہا ”خدا کے لیے اس نوجوان کی جان نہ بیجیے۔“ میری درخواست سنتے ہی اس نے نہایت متین صورت بنائی، مجھے بہت گھور کے غصے کی نگاہ سے دیکھا اور نہایت برہمنی کی آواز میں پوچھنے لگا ”وہ تمہارا کون ہے؟“

میں: وہ میرا عزیز ہے۔ اُسی کے ساتھ کھلائق رہی اور اُسی کے ساتھ پل کے بڑھی ہوئی ہوں، اور اُسی سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اسی سبب سے اکیلا وہی میری جان و دل کا مالک ہے۔

خورشاہ: تمہاری شادی ابھی اُس کے ساتھ نہیں ہوئی؟

میں نے نظر پیچی کر کے جواب دیا ”نہیں۔“

یہ جواب سُن کے خورشاہ نے مجھے بدگمانی کی مُتحسِس نگاہوں سے دیکھا اور کہا ”مگر شادی سے پہلے ہی تمہارے اُس کے ایسے تعلقات ہو گئے کہ گھر بارچھوڑ کے ساتھ نکل کھڑی ہوئیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تمہاری عفّت میں داغ لگ گیا۔“

”اسکا جواب دیتے وقت مجھے بے انتہا شرم معلوم ہوئی۔ کسی طرح کوئی لفظ میری زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ مگر صرف اپنی اور تمہاری آبرو بچانے کی غرض سے میں نے دل کو کڑا کر کے اور بے حیائی

گوارا کر کے جواب دیا۔ میں تو اپنے بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کو اور دوسرے حج کو نکلی تھی۔ مگر ہاں،
یہ الجتنہ ارادہ تھا کہ قزوین پہنچ کے عقد کر لوں گی۔“

خورشاد: نکاح کی رسم تو قزوین میں ادا ہوتی مگر غالباً تم آپس میں میاں بی بی کے تعلقات پہلے
ہی قائم کر چکے تھے۔

”اس سوال پر میں اس قدر شرمائی کہ سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا۔ پنجی نظر کر کے بلکہ یوں کہنا چاہیے
کہ شرم کے مارے آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔“ نہیں۔ میری عفت میں فرق نہیں آیا۔“ اتنا سُنْتَه
ہی خورشاد ایک بے اختیاری کے جوش میں یہ کہتا ہوا میری طرف دوڑا۔“ شکر ہے کہ میری ناز نہیں
کے پاک جسم کو ابھی کسی کا ہاتھ نہیں لگا۔“ قریب تھا کہ وہ مجھے گلے لگائے مگر میں نے دونوں ہاتھوں
سے روکا اور اس کے ہاتھ سے بچنے کے لیے پاؤں کے پاس زمین پر گر کے کہنے لگی۔“ اُس نوجوان
کی جان نہ لیجیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔“ خورشاد دیر تک سوچتا رہا پھر مجھے اٹھا کے بولا۔“ زمردا! یہ
بہت ضروری ہے کہ وادی اُس ضدی شخص سے خالی کی جائے۔“

میں: آہ! میں نے اُسے وصیت کر دی تھی کہ میں مر جاؤں تو گھر کے عزیزوں کو میری عفت و
پاک دامنی کا یقین دلانا۔ مگر افسوس! اُس نے نہ مانا۔

”یہ سُنْتَه ہی خورشاد چونک پڑا اور بولا۔“ کیا تم نے اُسے گھر جانے کی وصیت کی تھی؟“
میں: جی ہاں۔ وصیت کیسی، بہت تاکید و اصرار کے ساتھ کہا تھا۔

خورشاد: تو خیر، کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ وہ وادی بھی اُس سے خالی ہو
جائے گی اور اُسے کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچے گا۔ مگر زمردا! یہ سب کچھ صرف تمہاری نظرِ محبت کی امید پر
منحصر ہے۔“

”اس کے جواب میں کچھ کہنا مجھے بالکل بے موقع معلوم ہوا۔ خاموش کھڑی رہی۔ خورشاہ نے قلم و دوات منگا کے ایک خط کا مسودہ لکھا اور اُسے میری طرف پڑھا کے کہا ”اُسے تم اپنے ہاتھ سے صاف کر دو،“ میں نے اُسے اس کے سامنے وہیں بیٹھ کے صاف کر دیا۔ میں واپس نہیں آئی تھی کہ ایک دودھ لانے والی دہکانی کو بُلوا کے خورشاہ نے وہ خط اس کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ تمہاری غفلت میں قبر پر رکھ دیا جائے۔ یہ میرا پہلا خط تھا۔ میں اس حال کا پہلے بھی بیان کر چکی ہوں۔ مگر پھر کہتی ہوں کہ کیسے کیسے ظلم ہوئے ہیں اور کیسی کیسی مجبوریاں پیش آئی ہیں، جب میں نے تم کو خط لکھا ہے۔

اس خط کے رو انہ ہو چکنے کے بعد جب میں واپس آئی تو انتہا سے زیادہ حیران تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب مجھ سے ما یوس ہو کے تم گھر چلے جاؤ گے۔ روز اسی ادھیرُن میں رہتی تھی کہ تمہاری زبان سے میری موت کا قصہ سن کے اتنا اور ابا کے دل پر کیسی گزری ہو گی۔ کئی ہفتے اسی حالت میں گزر گئے۔ وہ ہور جس کا نام مرجان تھا، روز میرے پاس آتی اور ہمیشہ ہمدردی ظاہر کرتی۔ مگر مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خورشاہ کی سکھائی پڑھائی تھی اور اُس سے روز جا جا کے کہہ دیا کرتی تھی کہ میں تمہارے لیے کس قدر حیران رہتی ہوں۔ ایک دن اُس نے باتوں میں پوچھا کہ زمرہ، تمہارا مکان آمل میں ہے؟ میں چونک کے بولی ہاں کیوں؟“

مرجان: وہیں کے ایک زبردست عالم جو فی الحال غیثا پور میں رہتے ہیں، لوگوں کو ہمارے خلاف بہکار ہے ہیں اور اس کو جنتِ فریب بتاتے ہیں۔

میں: کون؟ امامِ جمیل الدین غیثا پوری تو نہیں؟

مرجان: ہاں، وہی۔ اُن کے قتل کی تجویز ہو رہی ہے۔

میں: (چونکر) ہائے! یہ تو بڑا ظلم ہے۔ وہ بڑے باخدا عالم ہیں۔ حسین کے اُستاد ہیں اور اُنھیں کے وہ مرید ہیں۔

مرجان: (تعجب سے) حسین ان کے شاگرد اور مرید ہیں؟

میں: اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے بھتیجے بھی ہیں۔

اس کے بعد میں دل میں افسوس کرتی رہی کہ یہ ظالم ناقص ایک باخدا شخص کی جان لیتے ہیں اور انھی خیالات کی وجہ سے میں نے رات کوئی پریشان اور مہیبِ خواب دیکھے۔ دوسرے دن اُٹھی ہی تھی اور آفتاب اچھی طرح بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ مرجان آئی اور کہنے لگی ”چلو، زمردا تمھیں خورشاہ نے بُلا یا ہے۔“

میں: (پریشانی کی صورت بنائے) کیوں؟

مرجان: میں کیا جانوں۔ مگر اسی وقت چلو۔

محبُوراً میں اُس کے ساتھ گئی اور وہاں جا کے دیکھا کہ وہ تو ایک خوبصورت لڑکی کے ہاتھ سے جامِ شراب پی رہا ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی بولا۔

خورشاہ: تم کسی طرح حسین کے خیال کو نہیں چھوڑتیں۔ اگر میری آرزو پوری کرنے کا اقرار کرو تو تمھیں اُس سے ملا دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔

یہ الفاظ سُننتے ہی میرے دل میں ایک خفیہ سی مسرت پیدا ہوئی۔ مگر اُس کی شرط بالکل ایسی تھی جیسے شربت کے جام میں زہر ملا ہوتا ہے۔ میں نے کسی اور خیال کو دل میں دبا کے کہا ”اگر آپ کے رحم نے مجھے اُن سے ملا دیا تو زندگی بھر لوٹدی رہوں گی۔“

میرے اس جواب سے وہ خوش ہوا اور فوراً ایک دوسرے خط کامسوڈہ دے کے کہا ”اسکو اپنے قلم

سے صاف کر دو۔“ میں نے مسُودہ ہاتھ میں لے کے پڑھا اور خورشاہ کی طرف دیکھ کے پوچھا ”
اب تو حسین اس وادی سے چلے گئے ہوں گے۔“

خورشاہ: نہیں۔ اُس نے تمہارے خط کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ اُسی طرح قبر کا مجاور بنا بیٹھا ہے۔ تم اُسے باوفا اور پچا عاشق سمجھتی تھیں، مگر وہ تمہاری پرواہ بھی نہیں کرتا۔ اس دل کش وادی میں اس کا ایسا دل لگ گیا ہے کہ اب تمہارے حکم کو بھی نہیں مانتا۔

میں: نہیں۔ وہ ایسے ہی باوفا ہیں جیسا کہ میں سمجھتی ہوں۔ جس طرح میری جدائی گوارہ نہ تھی اسی طرح اب انہیں میری قبر کی مفارقت گوارانہ ہو گی۔

حسین: (جو شہ میں آ کے) بیشک زمرہ! اصرف اسی خیال سے میں نے تیرا حکم نہیں مانا۔

زمرہ: خیر، میری زبان سے یہ باتیں سُن کے اس نے ایک حرمت کے ساتھ گھور کے دیکھا اور کسی قدر پست آواز میں بولا ” یہ مسُودہ جلدی صاف کر دو کہ وہ تم سے ملنے کا سامان کرے، مجھے اُس مسُودے کے پڑھتے ہی حرمت ہو گئی۔ پڑھتی جاتی اور دل میں کہتی جاتی تھی کہ یہ لوگ کس قدر منگار اور فربی ہیں۔ بہر حال، میں نے خط صاف کر کے دے دیا اور چلی آئی۔ دوسرے دن مجھے مر جان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ خط تمہارے پاس بھیج دیا گیا اور اس سے یہ غرض تھی کہ تمھیں شیخ علی وجودی کا معتقد بنائے انجھی کے ذریعے سے امام نجم الدین نیشا پوری تمہارے ہاتھ سے قتل کرائے جائیں۔ اس صلے میں تم جنت کی سیر کرو اور مجھے تم سے ملنے کا موقع ملے۔ حسین! کیا کہوں۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں نے اپنے اوپر کتنی لعنت ملامت کی۔ دل میں ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم اُن کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ لو۔ دعا کرتی تھی کہ خدا کرے پہلے خط کی طرح تم اس خط پر بھی عمل نہ کرو۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہاں کے بھیجے ہوئے گدھے پرسوار ہو کے تم روانہ

ہو گئے تو دل میں اور ڈری اور دعا کرنے لگی کہ خداوند! حسین کو اس گناہ سے بچا۔ مگر بعد مدت کے جب معلوم ہوا کہ اب دو تین دن میں جنت میں آیا چاہتے ہو، مجھے یقین ہو گیا کہ تم ان ظالموں کے پھندوں میں پھنس گئے ہو۔ جب تم اُس وادی کو چھوڑ کے چلے گئے تو یہاں کی ہجوریں اکثر اوقات سیر و تفریح کی غرض سے وہاں جانے لگیں، جن کے ساتھ خورشاد کی اجازت سے میں بھی کبھی چلی جاتی تھی اور اپنی قبر کو دیکھ کے تمہارے خیال سے اکثر ہی دل میں روئی تھی۔

جب تم جنت میں آئے، اس سے پہلے مجھے بتا دیا گیا کہ تم سے کیوں کر ملوں، کس قسم کی باتیں کروں اور تمہارے اعتقاد کو کس طرح بڑھاؤں۔ امید تھی کی اس کے ذرا بھی خلاف ہو اور ذرا سا بھی راز تم پر ظاہر ہو گیا تو تم سے پہلے میں مارڈا لی جاؤں گی۔ پھر ہر وقت یہاں میری اور تمہاری نگرانی ہوتی رہتی تھی اور مجھے تم سے ایک لفظ بھی کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری یہ حالت نظر آئی کہ جیسے تم پر کوئی جادو چلا ہوا تھا اور اپنے ہر نیک و بد سے بے خبر تھے۔ ایسی حالت میں اس کی امید نہ تھی کہ تم سے کچھ کہوں گی تو تم اُسے ضبط کر کے چھپا سکو گے۔ اسی خیال سے میں نے کچھ نہ کہا۔ تاہم موقع پا کے اتنا بتا دیا تھا کہ ناؤمیدی کی حالت میں میری قبر پر آنا اور آخر اسی تدبیر سے خدا نے کامیاب کیا۔ مگر حسین! میں نے خورشاد کے ہاتھ سے تمہارے لیے بڑے بڑے ظلم اٹھائے۔ برائے نام اس جنت میں تھی۔ تمہارے جانے کے بعد اور زیادہ سختیاں ہو گئیں۔ اب خورشاد کو خیال ہو چکا تھا کہ میں کبھی اس کے موافق نہ ہوں گی۔ مگر لوگوں کے کہنے سننے اور اس کے دلی میلان کا نتیجہ تھا کہ اس وقت تک زندہ ہوں۔

حسین: (زمر دکو گلے لگا کر) غنیمت ہے کہ اتنی مصیبتوں کے بعد ہم پھر مل گئے۔ مگر اب مجھے ضرورت ہے کہ ان ظالموں سے ان باتوں کا انتقام بھی لوں۔ جب تک انتقام نہ لوں گا

تب تک چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ میرے گناہوں کا کفارہ یہی ہے کہ دنیا کو خورشاہ، علی وجودی اور طورِ معنیٰ کی نجاست سے پاک کرو۔ جس طرح ابھی ان لوگوں کا فدائی تھا، اب دین کا سچا فدائی رہوں گا۔ ان کے مستقر پر جاؤں گا اور اسی بہانے سے ان لوگوں کو جنت کی بجائے دوزخ میں بھیجوں گا۔

زمرد: تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ فی الحال عید قائم قیامت ہے۔ یہ سب لوگ یہیں آئے ہوئے ہیں۔ اسی قلعے میں موجود ہیں۔ اور ان کی سزا دہی کا بھی پورا انتظام ہو گیا ہے۔ آج ہی شام تک تمہیں موقع عمل جائے گا کہ شہزادی بلغان خاتون کے ساتھ خورشاہ کے محل میں اور قلعے میں گھس کے ایک ہی وقت تینوں کا کام تمام کرو۔

حسین: زمرد! تجھے یہاں کے حالات کیونکر معلوم ہو گئے؟

زمرد: حوروں اور جنت والوں سے کوئی راز چھپا تھوڑا ہی ہے۔ مرجان کی طرح یہاں کی بعض حوریں خورشاہ کے محل میں جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دوسر وقت اس کی صحبت میں موجود رہتی ہیں۔ یہ حوریں جب واپس آتی ہیں تو جو کچھ دیکھتی سنتی ہیں، دوسروں سے کہہ دیتی ہیں۔ اس طرح تھوڑی دیر میں ہر بات سب میں مشہور ہو جاتی ہے اور کسی نہ کسی ذریعے سے میں بھی سُن لیتی ہوں۔ اور ہاں حسین! یہ تو بتاؤ کہ شہزادی کے ساتھ فوج کتنی ہے؟

حسین: فوج؟ تھوڑے سے جوان ہوں گے۔

ناگہاں ایک شورا اور ہنگامے کی آواز بلند ہوئی۔ دونوں گھبرا کے محل سے باہر نکل آئے اور سپاہیوں کا عظیم الشان لشکر دیکھ کے اس کے محل کی طرف دوڑے جہاں شہزادی بلغان خاتون آرام کر رہی تھی۔

انتقام

حسین اور زمرد نے اپنے قصر سے نکل کے دیکھا تو عجب عالم نظر آیا۔ جنت کے آرام واطمینان میں فرق آ گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا فردوسِ بریں میں قیامت آ گئی ہے۔ خوبصورت پری چہرہ حُور و غلامان جو اپنے حسن و جمال سے ہر ایک کونورانی پیکر ہونے کا دھوکہ دیتے تھے، قصروں اور کوشکوں سے نکل نکل کے بدحواس بھاگے اور ایک دوسرے کی آڑ میں چھپنے لگے۔ ہر طرف تھملکہ پڑ گیا۔ جہاں رونا حرام بتایا جاتا تھا، وہیں ہر طرف رو نے پسٹنے اور نوحہ و بکا کی آواز بلند ہوئی۔ ایک عظیم الشان اور بڑا بھاری تاتاری لشکر جنت میں داخل ہو گیا تھا، جس کے سپاہی ہر چہار طرف پھیلتے جاتے تھے۔ قصروں اور کوشکوں میں لوٹ مارچ گئی تھی۔ خوبصورت لڑکیاں اور پری جمال لڑ کے گرفتار ہو رہے تھے، جن کی سہی ہوئی صورتوں اور چین و پکار کی آوازوں سے عجیب نازک گھڑی کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ وحشت انگیز اور بدحواس کرنے والا سماں دیکھتے ہی زمرد شہزادی کی آرام گاہ ہوئے اس کوشک میں پہنچے جہاں شہزادی بلغان خاتون آرام کر رہی تھی۔ زمرد شہزادی کی آرام گاہ کے قریب پہنچ کے دستک دینے کو ہی تھی کہ ایک وحشی اور غارت گرت تاتاری اُس کی طرف جھپٹ پڑا۔ حسین کے پاس کوئی ہتھیار تو نہ تھا، وہ اپنی فدائیت کا خنجر لے کے دوڑا۔ قریب تھا کہ اُس میں اور تاتاری میں لڑائی ہو جائے کہاں کمرے کا دروازہ گھلا اور خوبصورت شہزادی بلغان خاتون اپنے بکھرے ہوئے اور لشکر کے ساتھ باہر نکلی اور تاتاری زبان میں چلا کے بولی ”ٹھہرو!“، شہزادی کی صورت دیکھتے ہی تاتاری دوڑ کے اس کے قدموں پر گر پڑا اور عرض کیا کہ ہم حضور کی تاش میں تھے۔

شہزادی: تم میرے ساتھ والوں میں سے ہو؟

تاتاری: نہیں۔

شہزادی: (خوش ہو کے) بھائی آگئے؟

تاتاری: جی ہاں۔

ناگہاں تاتاریوں کا ایک بڑا غول نظر آیا جن کے درمیان میں خود ہلاکو خان بھی موجود تھا۔ شمشیر بر ہند اس کے ہاتھ میں تھی۔ ہلاکو خان کو آتے دیکھ کے بلغان خاتون استقبال کو دوڑی۔ بہن بھائی جوش و خروش اور گرم جوشی سے ملے۔ وحشی اور عارت گر جوانوں نے ایک گھڑی کے لیے مہذب بن کے اور مرتب ہو کے اپنی حسین و ناز نیں شہزادی کو سلام کیا اور ہر طرف سے خوشی و مسرت کے نعرے بلند ہونے لگے۔

بلغان خاتون: (ہلاکو خان سے) بھائی۔ آپ کب آئے؟ مجھے تو تردد ہو چلا جاتا تھا۔

ہلاکو خان: تم کہتیں اور میں نہ آتا؟ اس میں شک نہیں کہ اس وقت سلطان و پیغم کے تعاقب میں عجلت کرنے کی ضرورت تھی مگر تمہارا خط دیکھتے ہی مجبور ہونا پڑا۔ میں نے تھوڑی سی فوج اس کے تعاقب میں چھوڑ دی اور باقی لوگوں کو ساتھ لے کے چلا آیا۔

بلغان خاتون: میں روانہ ہونے سے کئی دن پہلے آپ کو اطلاع دے چکی تھی۔ اسی خیال سے زیادہ فوج اپنے ہمراہ نہیں لائی۔ لیکن آج صحیح جو آپ کے پہنچنے میں دیر ہوئی تو میرا تردد بڑھتا جا رہا تھا۔

ہلاکو خان: میں نے بہت کوشش کی کہ صحیح تر کے پہنچ جاؤں مگر کسی طرح نہ پہنچ سکا۔ خیر، اب بھی چند اس دیر نہیں ہوئی۔

اس کے بعد بلغان خاتون نے زمر دا اور حسین کو ہلاکو خان کے قدموں پر گرا یا اور کہا ”یہی وہ لوگ ہیں جن کی مدد سے میں یہاں تک آ سکی۔“ ہلاکو خان نے انھیں اٹھا کے گلے سے لگایا اور کہا ”اپنی بہن کی طرف سے میں بھی شکر گزار ہوں۔“

دونوں نے جھک کے اس کے قدم چو مے اور کہا ”حضور ہی کی توجہ سے ہم کو اس قید خانے سے نجات ملی ورنہ زندگی بھرنجات کی کوئی امید نہ تھی۔“

بلغان خاتون: اور بھائی! آپ کے ہمراہ کتنی فونج ہے؟

ہلاکو خان: میں پچاس ہزار فونج لے کے چا تھا۔ راستے میں وہ چالیس ہزار جوان اور خُد آمِل گئے

جو تمہارے ساتھ آئے تھے۔ اب کل توے ہزار تاتاری میرے ہمراہ ہیں۔ مگر ان میں سے صرف پانچ ہزار آدمی اندر لا یا ہوں۔ اس لیے کہ راستے کی دشواریوں کے باعث اس سے زیادہ فونج کا یہاں لانا غیر ممکن تھا۔

بلغان خاتون: اور باقی ماندہ فونج نہر کے کنارے پڑی ہوگی۔

ہلاکو خان: نہیں۔ میں نے کئی منزل پیشتر سے اپنی فونج کے چالیس ہزار آدمی قلعہ الموت پر پہنچ دیے تھے جو آج ہی پہنچ گئے ہوں گے اور قلعے کے اندر سے ہماری طبل و قرنا کی آواز سنتے ہی یورش کریں گے۔ نہر ویرنجان کے کنارے پہنچ کے جب معلوم ہوا کہ زیادہ آدمی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تو میں نے طوبی خان کو باقی ماندہ فونج کا سردار مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ بھی الموت ہی پر جا کے حملہ کرے۔ اس کے ساتھ ۲۵ ہزار فونج ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ وقت پر نہ پہنچ سکیں گے۔ مگر اتفاقاً خوش قسمتی سے ایک یہیں کا کوہستانی شخص مل گیا جس نے بتایا کہ الموت بہت قریب ہے۔

زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے میں پورا شکر وہاں پہنچ سکتا ہے۔ طوبی خان اُس شخص کو ساتھ لے کے گیا ہے اور یقین ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی قلعے کے پھاٹک پر پہنچ گیا ہو گا۔ خیریہ بتاؤ کہ قلعے کا راستہ کدھر ہے؟

بلغان خاتون: تو بھائی تھوڑی دیر ٹھہر کے ستالو، پھر چلنا۔ تم ابھی منزل مارے اور تھکے ماندے چلے آ رہے ہو۔

ہلاکو خان: (ہنس کے) ہمارا آرام اسی میں ہے کہ جوہر شجاعت دکھانے کوئی اچھا میدان جنگ ملے۔ جب تک فتح حاصل نہ ہو لے، اس وقت تک کوئی چیز ہماری تھکان کو نہیں مٹا سکتی۔ ہاں البتہ تمہارے تھکنے کا مجھے لحاظ ہوتا۔ مگر تم مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی ہوا اور اچھی طرح ستا چکی ہو۔ لہذا اب کسی بات کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

حسین: (جوش و خروش سے قدم آگے بڑھا کے) حضور بے شک انتظار نہ کرنا چاہیے۔ مجھے ان لوگوں نے اتنا فریب دیا ہے اور میرے ہاتھ سے ایسے گناہ کرائے ہیں کہ جب تک ان میں سے خاص تین شخصوں کی جان نہ لے لوں گا، چیں نہ پڑے گا۔ ہر وقت میرے دل سے انتقام کی آواز نکلتی ہے۔ پریشان ہوا جاتا ہوں۔

ہلاکو خان: (مسکر کے) ہاں، ذرا بیان تو کرو کہ تمہیں کیوں فریب دیا گیا تھا؟
شاہی حکم کی تعمیل میں حسین نے اپنی سرگزشت مختصر الفاظ میں بیان کی اور آخر میں آبدیدہ ہو کہ کہنے لگا ”افسوس! زمر دکی محبت کے نام سے اتنے بڑے اور ایسے فریب دیے گئے ہیں کہ جب تک زندہ ہوں اپنے اوپر لعنت کروں گا۔

ہلاکو خان: (حیرت سے) واقعی، ان لوگوں نے دنیا کو مکاری اور ریا کاری کا عجب جال ڈال رکھا

ہے اب اس قلعے کی فتح کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ملاحدہ کی نجاست سے ساری دنیا کو پاک کر دوں

حسین: اگر ایسا ہوا تو خدا تعالیٰ آپ سے بہت خوش ہو گا اور دنیا ہمیشہ کے لیے آپ کے مبارک
اسلحہ کی منون احسان رہے گی۔

ہلاکو خان: تو چلو۔ اب تا خیر میں نقصان ہے۔ ہماری فوج جو قلعہ کے گرد ڈھہری ہوئی ہے متعددو
پر یثان ہو گی۔

زمرد: یہ کام میرے ذمے ہے، حضور! آپ کی اس لوگوں کے سوا کوئی اس راستے سے واقف
نہیں ہے۔ مگر اپنے ہمراہ یوں کو حکم دیجیے کہ جب تک محل کے اندر نہ داخل ہو لیں، نہایت خاموشی
سے چلیں۔ پہلے سے خبر ہو گئی تو محل سرائے کا پھاٹک بند کر لیا جائے گا اور پھر قلعے کی طرف جانے
میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

زمرد کی ہدایت کے مطابق ہلاکو خان نے اپنے تمام ساتھیوں کو ساکت و صامت اور آہستہ قدم
اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ پانچ سوتا تاری جو قراقرم سے شہزادی کے ہمراہ آگئے تھے اور اب اس پانچ
ہزار فوج کے بعد وہ جنت کے اندر داخل ہو گئے تھے، وہی جنت میں چھوڑ دیے گئے تاکہ اسی روشنی
خُور غلام کی حفاظت کریں۔ ہلاکو خان الموت کے قصر شاہی کی طرف اس شان سے روانہ ہوا کہ
آگے آگے حسین تھا۔ اب اسے کسی تا تاری جوان سے ایک تلوار مل گئی تھی، جسے وہ غضب اور انتقام
کے ارادے سے علم کیے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے خود ہلاکو خان تھا جس کی دہنی طرف بلغان
خاتون تھی اور باعیں طرف زمرد تھی اور ان کے پیچھے پانچ ہزار تاریوں کا غول تھا، جو باوجود ازاد
حام و جوش و خروش کے نہایت ہی سکوت و متنانت کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔

نہر ویرنجان کے اس طرف تمام چمن اور دل کش قطعاتِ باغ طے کر کے یہ پُرسکوت گروہ نہری پُل پر پہنچا۔ زمر دنے بڑھ کر پُل کا قفل کھولا۔ آج صحیح ہی کو راستہ روکنے کے لیے اس پُل میں قفل ڈال دیا گیا تھا۔ پُل کا پھاٹک کھلتے ہی سب نہر سے اُتر اُتر کے ایک پر فضا اور دل کش مرغزار میں داخل ہوئے اور زمر د کے بتانے کے موافق ایک خوش نما اور خوش گوار راستے سے گزر کر بڑے بڑے سایہ دار درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ انھیں درختوں کے گھونگھٹ میں رکن الدین خور شاہ کے محل سرا کا خوبصورت دروازہ چھپا ہوا تھا۔ دروازے کی صورت دیکھتے ہی یہ لوگ دوڑ کے اندر گھس گئے اور قبل اس کے کہ کسی کو خبر ہو، ایک طولانی ڈیوڑھی کو قطع کر کے خوش نما اور فرحت بخش خانہ باغ میں جا پہنچے جوانی شادابی اور دلکشی میں الموت کی جنت سے کم نہ تھا۔

ان خلل اندازوں کی صورت دیکھتے ہی چند سپاہی جو پہرے پر متعین تھے، اپنا اسلحہ لے کے دوڑے مگر جب دیکھا کہ تاتاریوں کا ایک لشکر ہے تو وہ بد حواس بھاگے۔ دو چار مارے گئے اور بقیہ اسیف نے بھاگ کے سارے محل اور قلعے میں ہل چل ڈال دی۔ قلعے میں مذہبی عید کی رسماں بجا لائی جا رہی تھیں اور بیرونی اور نیز یہاں کے لوگوں کا بڑا بھاری مجمع تھا۔ اگر حواس سے کام لیا جاتا تو ممکن تھا ایک معركے کی لڑائی ہوتی۔ مگر تاتاریوں کی ہیبت اُن دنوں ساری دنیا میں پیش ہوئی تھی۔ اُن کے قلعے میں داخل ہو جانے کا سُنّتہ ہی سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خود خور شاہ جو کھڑا ٹھپبہ پڑھرہا تھا، ممبر سے اُتر کر بد حواس بھاگ کے کسی کو نے میں جا چھپے۔ مگر جانے نہ پایا تھا کہ محل کی نازک انداام اور پری جمال عورتیں برہنہ پا بھاگ بھاگ کے آتیں اور قدم پر اُس کے دامن سے لپٹ کے پناہ مانگتی تھیں۔ اس وقت یہاں اس کی خبر نہ تھی کہ قلعے کے گرد سے بھی ایک بڑا بھاری اور عظیم تاتاری لشکر محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ بادشاہ اور مُعتقدوں کو بد حواس دیکھ کے تمام سپاہی اور

اہل قلعہ، داعی اور فدائی قلعے کے پھاٹک کھول کے بزدلی اور خوف کی آوازیں بلند کرتے ہوئے باہر نکلے، جن کے نکلتے ہی قلعے کے اندر مغلی طبل اور قرنا بجی اور تاتاریوں کے باہر والے تاتاری لشکر نے قومی باجوں کی آواز سنتے ہی خود اپنا طبل بجا کیا اور فوراً حملہ کر دیا۔ بھاگ کے باہر جانے والے، تاتاری لشکر کے مُقلا طبم سمندر کو ایک طوفان کی طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر نہایت ہی از خود فٹگی کے ساتھ اٹھ لئے پھرے، جن کا طوبی خان کے لشکر نے بڑی پھرتی سے تعاقب کیا اور باہر کے جان بازوں کو قتل کرتے ہوئے قلعے کے اندر گھس پڑے۔

اب قلعے کے اندر سخت طوفان بپا تھا۔ ہر طرف قتل عام کا سامان نظر آ رہا تھا۔ بوڑھے بچے، زن و مرد، اہل حرفة اور سپاہی سب بلا استخنا اور امتیاز قتل ہو رہے تھے۔ ایک عجیب ہنگامہ تھا جس میں تیرا ورنیزے، تلوار اور چھڑی اور گرز اور تبر کی ہولناک آوازوں کے ساتھ تاتاری لشیروں کی وحشت ناک چینیں، عورتوں اور بچوں کی آہوزاری اور روئے نے پیٹنے کی آوازیں ایک ساتھ سنی جاتی تھیں۔

ہلاکو خان اور بلغان خاتون کے ہمراہی خور شاہ کے محل میں ایک ایک دالان میں گھس کے خوفزدہ عورتوں، مردوں بوڑھوں اور بچوں کو نکال نکال کے ہنکاتے ہوئے اُس بڑے میدان میں لائے جس جگہ چند منٹ پہلے عید کا جشن ہو رہا تھا اور عیش و مُسرت کے پُر جوش نعرے بلند ہو رہے تھے۔ دوسری طرف سے بھاگنے والوں کو طوبی خان کے ہمراہیوں نے نہایت ہی بدحواسی کے ساتھ ہنکا کے اندر کیا۔ وہ بھی اسی میدان میں آ کے مظلوم و پریشان حال دوستوں سے اندھوں کی طرح ٹکرانے لگے۔ کسی کو اپنے پرائے کا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص کے حواس غائب تھے۔ اور دشمن میں سے کسی کو پاتا تھا، مجنون یا ڈوبنے والوں کی طرح اُس کے دامن سے لپٹ کے پناہ مانگتا۔ یہ دل خراش منظر زمرد کے دل پر نہایت ہی اثر کر رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کی بے کسی دیکھ کے رواثتی تھی۔

کئی مرتبہ قلعے کی بعض ستم زدہ عورتوں کے ساتھ اُس کی زبان سے بھی چیخ کی آواز نکل گئی۔ زمرد کی پریشانی دیکھ کے بلغان خاتون اُس کے قریب آئی اور کہنے لگی ”زمرد! میں جانتی کہ تمھارا دل اس قدر کمزور ہے تو تم کو یہاں ہرگز نہ لاتی۔“

زمرد: (روکے) شہزادی، یہ سب میرا کیا ہوا ہے۔ جو خون کا قطرہ اس وقت قلعے میں گر رہا ہے اور گرے گا، اُس کے گناہ میں میرا نام بھی لکھا جائے گا۔ اور ممکن نہیں کہ اس کے انتقام سے نج سکوں

بلغان خاتون: یہ صرف تمھارے دل کا بودا پن ہے ورنہ ان لوگوں کا قتل کرنا گناہ نہیں۔ ذرا یہ تو خیال کرو کہ اس وقت ہم کیسے کیسے مقدس بزرگوں اور نامور لوگوں کا بدلہ لے رہے ہیں۔ جتنے لوگ یہاں مارے جائیں گے، ان سے زیادہ رو جیس اس وقت خوش ہو رہی ہوں گی اور ہمارے لیے خدا سے مغفرت کی خواست گار ہوں گی۔

زمرد: (ہچکیاں لے کے) جو کچھ بھی ہو مگر شہزادی مجھ سے یہ ظلم و جو نہیں دیکھا جاتا۔

بلغان خاتون: جب یہ ظلم و جور دل پر اثر کرے تو ان مظالم کو یاد کرو جو ان ظالموں کے ہاتھوں دنیا پر ہوتے رہے ہیں۔

تحوڑی ہی دیر میں قلعے کی نصف سے زیادہ آبادی قتل ہو گئی۔ لاشیں ہر طرف تڑپ رہی تھیں۔ ہر طرف سے پھر کتی ہوئی آتیں، ایک مقام پر بہت سی جمع ہو جاتیں اور ایک دوسری کو ماتیں اور باہم لپٹ لپٹ کے اچھلتی تھیں۔ مگر قاتلوں کا خیال بھی اس طرف نہ جاتا تھا۔ وہ برادر بے سر دھڑوں کو گرا گرا کے انھیں تڑپتی ہوئی لاشوں کے تو دوں کی طرف بڑھا رہے تھے۔

اب ہلا کو خان اسی ممبر پر کھڑا تھا جس سے خورشاہ حُطیبے کو نا تمام چھوڑ کے اُتراتھا۔ برہنہ و خون آ لود

تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس کی بہن شہزادی بلغان ممبر کے نیچے اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ حسین اگر چہ فوجی آدمی نہ تھا۔ مگر اسے انتقام کا پورا موقع ملا تھا اور دل کی آگ ملاحدہ کے قتل کی پیاس کو تیز کر رہی تھی۔ تا تاریوں کی بھیڑ میں گھس گھس کے وہ ان خاص لوگوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا جنھیں اس نے پہلے سے اپنا شکار تجویز کر لیا تھا۔ ناگہاں ایک شخص دوڑ کے اس کے دامن سے لپٹ گیا اور اس کے منہ سے آواز نکلی:

”حسین مجھے بچا۔ میں جانتا ہوں کہ تو شجرِ معرفت کی ایک شاخ ہے۔“ حسین سمجھ گیا کہ یہ کاظم جنوہی ہے۔ دل میں آئی کہ ایک ہی وار میں اس کا سر اڑا دے مگر خود ہی سوچا کہ اس سے طورِ معنی اور علی وجودی کا پتا لگ جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی ذرا دوستی کی شان سے کاظم جنوہی کی طرف جھک کے پُوچھا ”طورِ معنی کہاں ہے؟“

کاظم جنوہی نے یہ الفاظ سنتے ہی سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور ایک شنکستہ حال بُدھے کی طرف جو کئی آدمیوں کے درمیان زمین پر ننگے سر بیٹھا تھا، اشارہ کیا اور پھر زمین پر گر کے کہنے لگا اے شجرِ معرفت! مجھے پناہ دے۔“ حسین نے غضب آسود تیوروں سے اس کی ذلیل خوشامد کو دیکھا اور یہ کہہ کر کہ ججھ جیسے ذلیل فربی کے لیے پناہ نہیں ہے، اس کا سر اڑا دیا۔

کاظم جنوہی کو تڑپتا چھوڑ کے وہ اس بُدھے کی طرف گیا اور دیر میں پہچان سکا کہ طورِ معنی اوہی ہے۔ حسین نے اس مجمع کے اندر ہاتھ ڈال کے اُسے باہر کھینچا اور کہا ”آج تو میں نے ستر ہزار حباب خود ہی چاک کر ڈالے اور طورِ سینا کو بے حباب دیکھ رہا ہوں۔“ یہ جملہ سنتے ہی طورِ معنی نے حیرت و استعجاب سے حسین کی طرف دیکھا اور کہا ”اے نوجوان! تو کون ہے کہ رمزِ حقیقت سے آگاہ معلوم ہوتا ہے؟“

حسین: ہاں، خوب آگاہ ہوں۔ مگر آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا؟
ٹوہرِ معنی: نہیں، بالکل نہیں۔

یہ جواب سنتے ہی غصے میں آ کے حسین نے اس کے منه پر تھوک دیا اور کہا ”یا تو وہ کشف تھا کہ بغیر اسکے کہ میری صورت دیکھے اور میری آواز سنئے تو نے کہا تھا، اے نوجوان آمی، مر جبا۔ یا آج مجھے دیکھ کے بھی نہیں پہچان سکا؟ تیری سب سازشیں گھل گئی ہیں اور معلوم ہو گیا کہ تو کتنا بڑا مکار و بد معاش ہے۔“ اس جواب پر ٹوہرِ معنی جھک کر حسین کے قدم پھو منے لگا اور رُقت و بد حواسی کی آواز میں بولا ”رحم، جوان آمی۔“

حسین: ہرگز نہیں تو ایک فتنہ ہے جس سے دنیا کو جہاں تک ہو سکے جلد خالی کرنا چاہیے۔
یہ کہہ کر حسین ٹوہرِ معنی کے سینے پر چڑھ بیٹھا، تلوار زمین پر ڈال دی اور کمر سے خنجر نکال کے بولا ”یہی وہ فدائیت کا خنجر ہے جو میری کمر میں بندھوا�ا گیا تھا۔ اسی سے میں نے امام ناصر الدین احمد کے سے نیک نفس بزرگ کی جان لی تھی، اور اسی سے تیرانا پاک سینہ چاک کرنا چاہتا ہوں۔“ ٹوہرِ معنی پچھہ کہنے کو تھا کہ حسین کا خنجر اس کے سینے میں اتر گیا اور ایک ہی وار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک آہ کے ساتھ جان دے دی۔ حسین اپنی تلوار لے کے اٹھ کھڑا ہوا، مگر اچھی طرح کھڑا نہیں پایا تھا کہ دیکھا کہ کس قدر فاصلے پر ہلاکو خان کے قریب ہی ایک تاتاری ایک ضعیف العمر بڑھے کو اُس کے عمامے سے بامدھ کر کھینچ رہا ہے۔ حسین اُسے دیکھتے ہی پہچان گیا کہ علی وجودی ہے۔ بے اختیار دوڑا اور گپڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے چلا یا ”یہ میرا مجرم ہے۔“

تاتاری: کیوں؟ گرفتار میں نے کیا اور مجرم تھمارا ہو گیا؟

حسین: ہاں! اس لیے کہ یہ میرا قدیمی مجرم ہے۔

اس جملے کے ساتھ ہی ہلاکو خان نے اُس تاتاری کو اشارہ کیا کہ اس قیدی کو حسین ہی کے سپر دکر دے۔ حسین نے علی وجودی کو اسی طرح اُس کے عما مے کا ایک جھپکا دے کے دریافت کیا ”مجھے پہچانا!“

علی وجودی کچھ ایسی مایوسی اور از خود فٹگی کی حالت میں تھا کہ اس وقت اس نے دیکھا ہی نہ تھا کہ اُس کے سر پر کیا گدری ہے اور کس کے ہاتھ میں گرفتار ہے۔ حسین کی آوازُن کے اُس نے سر اٹھایا اور پہچانتے ہی چلا اٹھا ”آ ہا! حسین! مجھے تیری جستجو تھی۔ جب قلعہ الموت سے تیرے نکالے جانے کی خبر معلوم ہوئی تو مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ افسوس! اگر تو میرے پاس آ جاتا تو اس طرح ناکام نہ رہتا۔

دراصل علی وجودی یہ نہیں سمجھا تھا کہ حسین اب اس کے عقائد کے خلاف ہے۔ اسے خیال گزرا کہ اب تک یہ میرا معتقد ہے اور اسی وجہ سے مجھے تاتاریوں سے پھرفا کے بڑی دلیری اور بہادری سے بیہاں لایا ہے۔

حسین: (عقیدت کی شان اور عما مے کا سراچھوڑ کے) مگر آپ کو تو غیب کی باقی میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ آپ نے سیر لا ہوتی میں بے شک دریافت کر لیا ہو گا کہ میں کن پہاڑوں اور کن گھاٹیوں میں سر ٹکراتا پھرتا تھا۔

یہ سون کے علی وجودی نے حسین کو بدگمانی کی نظر سے دیکھا اور کہا ”سیر لا ہوتی اُسی وقت ہوتی ہے جب انسان توجہ قلبی سے کام لے۔“ دراصل میں نے تیرا حال دریافت کرنے کی جانب کبھی توجہ نہیں کی تھی۔

حسین: مگر یہ امید نہ تھی کہ مجھ سے عقیدت کیش کو آپ بالکل چھوڑ دیں گے۔

علی وجودی: او حسین! یہ فتنہ کیوں کر بپا ہوا؟ یقین ہے کہ تجھے معلوم ہو گا، اس لیے کہ تیرے کہنے سے تاتاریوں نے میری جان چھوڑ دی۔

حسین: آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ہر امر واقعہ ادنیٰ تو جہر قلبی سے معلوم ہو جاتا ہے۔

علی وجودی: اتنا جانے پر بھی تو عالمِ ارواح کے روز سے نا آشنا ہے۔ جن لوگوں کو ان رموز میں مکال حاصل ہوتا ہے، انھیں کبھی اپنی خبر نہیں رہتی۔ سنا نہیں:

گہے بر طارِ مائلے نشیم

گہے بر پُشتِ پائے خود نہ نشیم

حسین: رُکن الدین خورشاد نے مجھے جنت میں بھینے سے انکار کیا اور اپنے قلعے سے نکلا دیا جس کے بعد مایوسی تھی اور عجیب بے کسی کی حالت میں تھا۔ افسوس! اس وقت آپ نے خبر نہ لی۔ مگر معاملہ دگر گوں ہونے والا تھا۔ قدری نے مجھے ایک اور شخص سے ملا دیا اور اب اس کی برکت و رہبری سے جنت میں پہنچا اور زمُرد سے ہم کناری نصیب ہوئی۔ افسوس! کہاب میں آپ کے مریدوں سے نکل گیا اور اس کے مریدوں اور مُعتقدوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

علی وجودی: وہ کون شخص ہے؟

حسین: تاتاریوں کا سردار ہلاکو خان۔ اور اس کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

علی وجودی نے یہ سُننے ہی سر سے پاؤں تک کانپ کے حسین کی صورت دیکھی اور پوچھا ”وہ شرائط کیا ہیں؟“

حسین: وہ یہ کہ آپ جیسے جتنے مگار اور سیہ کار ملا جدہ ملیں، ان کا سرتن سے جدا کر دوں۔

علی وجودی: (سمم کے) اور ایسے ظالمانہ حکام بجالانے میں تمھیں تامل نہیں؟
حسین: بالکل نہیں۔ اسکا سبق تو آپ ہی سے مل چکا ہے کہ مُرید کو مرشد کے ہاتھ میں ایک
بے جان آ لے کی طرح رہنا چاہیے۔ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے اور اس کا باطن میرے
مرشد کے نزدیک بہت ہی اچھا اور حُدایتی درگاہ میں مقبول ہے۔

علی وجودی نے شرم کے اور سر جھکایا اور کہا ”مگر جو کچھ بھی ہو، تمھیں رحم سے کام لینا چاہیے۔“
اس جواب سے حسین کو بہت غصہ آیا مگر اُس نے ضبط کر کے اپنے تیس روکا اور کہا ”بے شک ظلم خدا
کو پسند نہیں ہے اور اسی وجہ سے امام نجم الدین غیثا پوری کی روح آج تک پکار پکار کے کہہ رہی
ہے کہ میرا خون علی وجودی کی گردن پر ہے۔“ یہ سنتے ہی علی وجودی سر سے پاؤں تک کاپنے لگا اور
تحوڑی دیر بعد جب اُس کے دل کو ذرا سکون ہوا تو بولا ”مگر میرے تمہارے ساتھ ایسے تعلقات رہ
چکے ہیں کہ مجھے تم سے بے رحمی کی امید نہیں۔“

حسین: امام نجم الدین غیثا پوری سے زیادہ مجھے آپ سے تعلق نہیں رہا ہے۔ وہ میرے پچھا تھے
اوستاد تھے، مرشد تھے۔

اب علی وجودی کو خوف نے اُس کے اختیار سے باہر کر دیا۔ وہ ایک دفعہ روتا ہوا حسین کے قدموں پر
گرا اور چلایا ”رحم رحم !!“

حسین: ہرگز نہیں۔ ہزار ہاپاک اور مقدس رُوحیں فریاد کر رہی ہیں جو یقیناً اب تمہاری نظر
کے سامنے ہوں گی اور تمھیں چاروں طرف سے دھمکا رہی ہوں گی۔

اور بے شک علی وجودی کی اُس وقت یہی حالت تھی۔ وہ بار بار چاروں طرف گھبرا گھرا کے دیکھتا
تھا اور ہر طرف اُسے کوئی مظلوم تصویر پھر یوں اور خبروں سے دھمکاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ عین اسی

حالت میں جب اس کے چاروں طرف چھر یا نظر آ رہی تھیں، حسین نے اپنے خیز کو
کمر سے نکالا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے کر کے کہا ”یہی وہ خیز ہے جو تم سے ملا تھا۔ اور امام نجم
الدین غیاثا پوری اور امام نصر الدین احمد کے سینوں میں خاص تمہارے حکم سے اور میرے ہاتھ سے
اُتر چکا ہے۔ یہ خیز آج تک باقی ہے اور صرف اس لیے کہ تمہارے سینے میں خاص میرے ہاتھ سے
سے اُتر جائے۔ اسے اچھی طرح پہچان لو اور تیار ہو جاؤ کہ انتقام کا وقت آ گیا۔“

علی وجودی: مجھے نہ مارو۔ اب میں کبھی نہ ہب باطنیہ کی طرف داری نہ کروں گا۔“
حسین: مگر تمہارا یہ عہد میرے دامن سے خون کے دھبے نہیں چھڑا سکتا جو تمہاری سیہہ کاریوں
سے لگے ہیں۔“ یہ کہہ کے حسین نے علی وجودی کو زمین پر گرا کیا اور اُس کے سینے پر
چڑھ کے پھر اس کا خیز آنکھوں کے سامنے پیش کیا اور کہا ”یہ دیکھو اور خوب
پہچان لو کہ یہ وہی تمہارا خیز ہے۔“

درحقیقت علی وجودی کی موت بُری موت تھی۔ اُس وقت تمام گناہ طرح طرح کی بھیانک
صورتوں کا جامہ پہن کے اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ہزار ہا مظلوم روحوں کو دیکھ رہا
تھا جو خیز دکھا دکھا کے اُسے ڈرا دھمکا رہی تھیں۔ اُس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں اور حسین سے
کہا ”خدا کے لیے چھوڑ دے۔ میری بے کسی پر حرم کھا۔“

حسین: نہیں۔ جس دل میں خود ہی خدا کا خوف اور ترس نہیں، اُس پر ترس کھانا گناہ ہے۔
علی وجودی: تو کم بخت! کہیں جلدی کام تمام کر، تاکہ ان بلاؤں سے پیچھا چھوٹے جو مجھے
گھیرے ہوئے ہیں۔“

حسین: میں فقط اتنے ہی کے لیے تامل کر رہا ہوں کہ تجھے موت کی نازک اور پُر خطر گھڑی کا

اپھی طرح مزہل جائے تو تیرا کام کروں۔

اب علی وجودی بہت بے تاب تھا، حسین کے نیچے دبا ہوا تھا اور حسین اس کا دیا ہو انہر اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر رہا تھا جس کی ڈراونی صورت سے ڈرڈر کے وہ اپنا سر ادھر ادھر ہٹالیتا تھا ”خدا کے لیے اس چیز کو میرے سامنے سے دور کرو۔“

آخر جب حسین نے دیکھا کہ بڑی دری ہو گئی ہے اور اب قریب قریب قلعے کی ساری آبادی قتل ہو گئی ہے تو اس نے بھی خبر بھونک بھونک کے اور آواز دے دے کے علی وجودی کا کام تمام کر دیا۔ اپنے سب سے بڑے بہکانے والے سے وہ انتقام لے کے پھر ہلاکو خان کے قریب گیا۔ اب تاتاریوں کو قتل کرنے کے لیے کوئی شخص نہ ملتا تھا۔ اتنے بڑے قتل عام سے اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور مجنون گتوں یا حشی درندوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے کہ کوئی ملے تو اُس کو قتل کر کے دل کا بخار نکالیں۔ سو اے چند کم سن اور حسین عورتوں کے جلوں دیاں بنانے کے لیے بچائی گئی تھیں، قلعے الموت میں کوئی باقی نہ رہا۔

اب فرمائے الموت رکن لا دین خور شاہ کی جستجو تھی۔ لوگ دری سے اُسے ڈھونڈھ رہے تھے۔ لیکن اُس کا پتائنا چلتا تھا۔ آخر ایک تاتاری تھ خانے میں گھس کے اُسے پکڑ لایا۔ جیسے ہی وہ ہلاکو خان کے سامنے لا یا گیا اور تاتاری سالار کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہوا، حسین نے جھپٹ کے ارادہ کیا کہ اپنے خبر سے اُس کا کام تمام کر دے۔ مگر ہلاکو خان نے چللا کے روکا اور کئی مغلوں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہلاکو خان: یہ یہاں کا بادشاہ ہے اور بے کسی کی صورت میں پناہ مانگتا ہوا آیا ہے لہذا اس کی جان بخشی کرنی چاہیے۔

حسین: حضور! اگر یہ فتح رہا تو دنیا میں بہت بڑا فتنہ رہ جائے گا۔ یہ ساری سازشیں اور تمام خرابیاں اسی کی ذات سے تھیں۔

ہلاکو خان: اب وہ سازش کرنے والے ہی نہیں رہے تو یہ کیا کرے گا۔ سب فربیتی تو خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔ یہ ایک نا تجربہ کارنو جوان دنیا کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

حسین: ایسا نہیں ہے کہ کوئی مُعتقد نہیں رہا ہو۔ مصر و شام سے لے کر سندھ تک ہر جگہ اس کے مُعتقد پھیلے ہوئے ہیں۔

ہلاکو خان: میں ان مقامات میں بھی جاؤں گا اور اس کے مُعتقد یں سے دنیا کو خالی کروں گا۔ مگر اس کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جلاوطن کر دیا جائے۔ (اس کے بعد اس نے خورشاہ کی طرف دیکھ کے کہا) ”بے شک تمہارا فتنہ بہت بڑا ہے۔ مگر اس بے کسانہ اور عاجزانہ خاموشی پر ترس کھا کے تمہاری جان بچائی جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ ترکستان میں، جہاں تم کو کوئی مُرید و مُعتقد نہ مل سکے، اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن بسر کرو۔ یہ جتنی عورتیں یہاں ہیں ان میں سے کوئی تمھیں نہیں دی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ان کے ذریعے سے پھر تمہارا فساد دنیا کو فریب دینے لگے۔ ترکستان میں جا کے تمھیں اختیار ہے کہ چاہے کسی تاتاری عورت سے عقد کر لینا۔“

اس حکم کے ساتھ ہی ایک مغلی دستے نے اُسے اپنی حرast میں لے لیا۔ حسین نے الموت کے تاجدار کو بخیر خزر کے اُس پار ترکستان کے کسی گمنام گاؤں میں پہنچا دیا اور یہاں جب قلعہ آدمیوں سے خالی ہو گیا تو تاتاری لُظیمرے دولت لُوٹنے، محلوں کو کھو دنے اور آگ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ محلوں اور جنت میں ہر جگہ آگ لگادی گئی۔ وہ قصر اور کوشکیں کھود کے زمین کے برابر کردی گئیں، جو جنت بنی ہوئی تھیں۔ اب ہر جگہ محض مٹی اور آینٹوں کے ڈھیر رہ گئے تھے۔ تاتاریوں نے

انھیں آنا فاناً ایسا کر دیا کہ نہ کوئی رہنے والا تھا نہ روئے والا۔

حسین اپنے دل کی آگ بُجھا کے اور انتقام لے کے جب زمرد کے قریب گیا تو وہ نہایت ہی پریشان اور بدحواس تھی۔ وفا کیش معشوقة کو اس قدر پریشان دیکھ کر اُس نے پوچھا ”زمرد، اب پریشانی کس بات کی؟“

زمرد: (روتی آواز میں) اتنا قتلِ عام، ایسی خون ریزی ہو چکی اور پوچھتے ہو کہ پریشانی کس بات کی ہے؟

حسین: ان ظالموں کی بتاہی پر خوش ہونا چاہیے یا غمگین؟

زمرد: تم خوش ہولو، جس کا دل خدا نے ایسا پھر کا بنایا ہے۔ ایسا وحشت ہاک منظر دیکھنا کبھی میرے خیال میں نہ گزرا ہو گا۔ میں ایسی حالتوں کو دیکھنے کی عادی نہیں ہوں۔

حسین: خیر، اب بتاؤ، کیا ارادہ ہے؟

شہزادی بالغان خاتون سامنے کھڑی تھی۔ یہ جملہ سُنتے ہی پاس آئی اور بولی ”ارادہ کیا! اب تم دونوں میرے ساتھ چلو۔ زمرد کو اپنی بہن سے زیادہ عزیز رکھوں گی اور تم کو بھی کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔

زمرد: نہیں شہزادی! ہم دونوں نے بڑے گناہ کیے ہیں۔ حج کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے، تقدیر نے ان مُصیپتوں میں بتلا کر دیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ پہلے حج کر لیں تو پھر اور کوئی کام کریں۔ اگر زندگی باقی ہے تو یہ فرض ادا کر کے ہم دونوں وہیں قراقرم میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ میں جب تک خانہ خدا میں اپنے لیے دعائے مغفرت نہ کر لوں گی۔ اس وقت تک یہ ندامت نہ ٹلے گی جو ہر وقت دل میں موجود ہتی ہے۔ کوئی وقت نہیں گورتا کہ یہ یاد نہ ستاتی ہو۔

حسین: بے شک، زمرد کا کہنا ٹھیک ہے۔ میرا دل ہمیشہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ شاید وہاں جا کے اور اس مقدس مقام میں دعا کر کے یہ بات دور ہو جائے۔

بلغان خاتون: کیوں کر کہوں۔ دل تو نہیں چاہتا کہ تم کو جُدا کروں۔ مگر اب تم کو اصرار ہے اور وہاں جانے کو اپنا فرض سمجھتے ہو تو مجھے، تو روکنا بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میری ایک بات مان لو۔

زمرد: جو حکم ہوا! آپ کا ہر حکم بجالانا ہمارا فرض ہے۔

بلغان خاتون: تم دونوں باہم عقد کرنے کی غرض سے نکلے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ جُدا ہونے سے پہلے تم دونوں کا عقد کر دوں تاکہ وطن جانے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو جائے کہ تم دونوں میں باہمی اتفاق کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور یہ بات یاد کر کے میں دل خوش کر لیا کروں کہ تمہاری آرزو ہمیں میرے ہی ہاتھ سے پوری ہو گئیں۔

یہ ایسی درخواست نہ تھی جس سے کسی کو انکار ہوتا۔ حسین نے صاف الفاظ میں رضا مندی ظاہر کر دی مگر زمرد مسکرائی اور ایک شرم کی آواز سے سر جھکا کے بولی ”اب میں آپ کی لوندی ہوں، اور جو حکم ہوا سے انکار نہیں کر سکتی۔“

دوسرے دن صحیح ہلاکو خان نے فتح کی خوشی میں اور مال تقسیم کرنے کے لیے بڑا بھاری جشن کیا جس کے لیے فوج کے معزز افسروں کی ایک محفل مرتب کی گئی۔ گز شتر فتح پر بڑے جوش و خروش سے اظہارِ مسرت کیا گیا اور اسی کامیابی اور ظفر کی یاد میں بلغان خاتون کی درخواست اور ہلاکو خان کے حکم سے شیخ نصیر الدین طوسی جیسے مُحقق زمانہ اور عالمہ روزگار نے جن کی تاتاریوں میں بڑی قدر و منزلت تھی اور جو اس موقع پر موجود تھے، حسین اور زمرد کا نکاح پڑھایا۔

اس کارروائی کے بعد سب آپس میں رخصت ہوئے۔ بلغان خاتون نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قراقرم کا راستہ لیا۔ ہلاکو خان نے اپنی فوج ظفر مونج کے ساتھ آذربیجان کی طرف کوچ کیا۔ حسین اور زمرد پھر اسی شان سے، جس طرح پہلے گھر سے نکلے تھے، ارضِ حجاز کی طرف روانہ ہوئے اور الموت کے ہندروں اور ان کی تمام لاشوں پر گدھوں اور مُردار خوار طیور کے بڑے بڑے غول چھوڑ دیے۔

زمرد اور حسین نے مکہ معظمہ میں پہنچ کر، غلافِ کعبہ پکڑ کے، نہایت ہی رقتِ قلب اور جوشِ دل سے مغفرت کی دعا مانگی کے اے اللہ! ہمیں تمام گناہوں سے نجات دے۔ اگر چہ ہم نے تیری نافرمانیاں کیں، تیرے مقبول و بے گناہ بندوں کی جانیں لیں مگر ہم ایک بڑے فریب میں مُبتلا تھے۔ شیطان کا ہم پر اس قدر تصرُف تھا کہ گناہوں کی بُرا نیاں نظر نہ آتی تھیں۔ ہم نے گناہ کیے مگر سمجھ کر نہیں، ہمارے قدموں کو لغزشیں ہوئیں مگر ایک بہت بڑے فریب میں مُبتلا ہو کے ٹو عالم الغیب ہے۔ دلوں کی باتیں جانتا ہے۔ ہماری بے کسی اور بے بسی کو دیکھ اور ان سخت گناہوں سے درگُور کر۔ اس طرح گناہوں کا زنگِ دل سے مٹا کے واپس روانہ ہوئے۔ چند روز اپنے شہر آہمل میں رہے اور باقی ماندہ زندگی قراقرم میں جا کے شہزادی بلغان خاتون کی صحبت میں صرف کر دی۔

-----☆☆☆-----